Cat by ash

(Ehon)



مولانا احسن مارہروی

ولادت ۱۸۷۶ء

وفات ۱۹۴۰ء

جلوۂ احسن

مولانا احسن مارہروی مرحوم کے اجمالی حالات

اور

مختصر کلام

پیش کردہ

سید رفیق مارہروی

قیمت

دو روپے پچاس نئے پیسے

ناشر

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۴۵۵۹

ناشر عزیز الرحمٰن   پرنٹر شاہی برقی پریس لکھنؤ

"ہر اولاد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کی مالی و اقتصادی خدمت کرے، مولانا احسن مارہروی مرحوم نے اپنی اولاد میں کسی کو بھی اپنے آخری لمحاتِ زندگی تک اس نوع کی خدمت کا موقع اور اجازت نہیں دی، وہ آخری سانسوں تک اپنے خود کفیل رہے،

اُن کی وفات کے بعد آج میری یہ جرأت میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن کی روح پاک پر کیا اثر ڈالے گی، فرض بھر فرض ہوتا ہے، اسی کو پورا کر رہا ہوں، ایک شفیق باپ کی حیثیت سے جب زندگی میں میری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے رہے تو کیا اب عالم ارواح میں مجھے بھلایا جا سکتا ہے۔ یقیناً میری یہ خدمت قبول ہوگی۔"

______ سید رفیق مارہروی

مؤلف کی دوسری کتابیں:-

(۱) مسلمان اور نظریۂ شرافت، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

(۲) زبانِ داغ، مطبوعہ نسیم بکڈپو، لکھنؤ

(۳) بزمِ داغ، مطبوعہ نسیم بکڈپو، لکھنؤ

(۴) ہندوؤں میں اردو، مطبوعہ نسیم بکڈپو، لکھنؤ

(۵) چُپ کی داد اور فریاد، مطبوعہ نسیم بکڈپو، لکھنؤ

(۶) تصویرِ داغ، زیرِ طبع نسیم بکڈپو، لکھنؤ

فہرست عنوانات

ابتدائیہ

ہر شاعر اور ادیب کی یہ خواہش ہوا کرتی ہے کہ لوگ اس کا کلام سُنیں، پسند کریں اور داد دیں، یہ خواہش بعض شعرا میں اتنی تیز اور قوی ہوتی ہے کہ وہ موقع و بے موقع، ضرورت و بے ضرورت، فرمائش و بے فرمائش اپنے کلام کو سُنانے کے لئے تازہ دم رہا کرتے ہیں، ایسے لوگ عام طور سے لوگوں کی نگاہوں میں بے وزن ہو جاتے ہیں، اس علت کی ترقی یافتہ صورت یہ ہوتی ہے کہ شعرا و ادبا اپنے کلام کی اشاعت و طباعت کے باب میں بڑا غلو پیدا کر لیتے ہیں، بدتر سے بدتر شاعر اور ادیب بھی چاہتا ہے کہ اس کا کلام شائع ہو اور لوگ اسے پسند کریں چنانچہ اُردو صحافت کا اگر جائزہ لیا جائے تو بیشتر شعراء کے دواوین اور کتابیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو نہ صرف بے ضرورت شائع ہوئی ہیں بلکہ اُردو زبان کے اثاثے میں ایک غلط اضافے کا باعث ہیں۔

مذکورہ بالا حالات کے دوش بدوش شعراء و ادباء کا ایک گروہ ایسا بھی ہمیشہ سے پایا جاتا رہا ہے جس کے افراد تخلیق شعر کی پوری پوری اہلیت رکھنے کے باوجود اور انتہائی پسندیدہ حالات و ماحول میں بھی یہ گوارا نہیں کرتے کہ لوگ خواہ مخواہ ان کا کلام سُنیں اور انھیں داد دیں یا اُن کا کلام شائع ہو کر انکی شہرت اور نام وری کی وجہ بنے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شعراء اور ماہرِ فنِ شعر گم نامی میں پڑ جاتے ہیں اور دُنیا ان کے کمالات سے محروم رہ جاتی ہے۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم دُنیائے شاعری کی ایک مشہور ہستی تھے، ان کی شہرت و نام وری کا انحصار ان کی شاعری و نثاری پر ہی نہیں تھا بلکہ ان خصوصیات سے زیادہ اہمیت ان کی علمی تباحر، تحقیق و تلاش، تہذیب زبان اور اجتہاد فن کو حاصل تھی، وہ مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے تھے، اُردو زبان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے انھیں ہندستان گیر شہرت حاصل تھی ان حالات کے باوجود جہاں تک اُن کی شہرت اور نام وری کا تعلق ان کی ذاتی "خواہشات" سے تھا وہ ہمیشہ شہرت و نام وری سے مستغنی رہے۔ ان کے ایک دوست مولوی قمر الحسن صاحب قمر بدایونی مرحوم اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"مرحوم کا کلام اگر جمع کیا جائے تو کافی ضخامت کے کئی دیوان مرتب ہو سکتے ہیں لیکن جب کبھی اس کا ذکر آیا یہی کہکر ٹال دیا کہ ابھی اتنا دیوانہ نہیں ہوا ہوں، اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ کلام کو جمع کرنے، ترتیب دینے، انتخاب کرنے اور چھپوانے کی طوالت سے گھبراتے تھے یا کلام کی اشاعت جو رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ ہوتی رہتی تھی اسی کو کافی سمجھتے تھے بہر حال اس کا ارمان یا ارادہ کبھی نہیں کیا (علی گڑھ میگزین احسن نمبر صفحہ ۹)

قمر صاحب کا یہ اندازہ ٹھیک نہیں تھا کہ مولانا کلام کے جمع کرنے، ترتیب دینے، انتخاب کرنے اور چھپوانے کی طوالت سے گھبراتے تھے، ان کا پورا کلام باقاعدہ مختلف بیاضوں میں ترتیب وار درج تھا، لہٰذا جمع کرنے، ترتیب دینے، انتخاب کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، رہا اس کی اشاعت کا سوال تو جو شخص اپنی مختلف و متعدد تصانیف اور تالیفات کی اشاعت و

طباعت کا عادی رہا اور جو کسی زمانے میں خود ایک پریس کا مالک ہو اس کے لئے اپنے دیوان کی اشاعت کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ دراصل بات یہ تھی کہ دوسری کار آمد اور مفید کتابوں کے مقابلے میں مولانا نے اپنے کلام کو کبھی اہمیت نہیں دی وہ ایک شاعر کی حیثیت سے ضرور مشہور رہے اور مشاعروں کی دنیا میں بڑی دل چسپی لیتے رہے لیکن اگر منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو انھوں نے اپنی شاعری کو ضمنی حیثیت سے زیادہ کبھی اہمیت نہیں دی، لوگوں کا یہ کہنا اگر سچ ہے کہ شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو دل سے شاعری کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو دماغ سے، تو مولانا یقیناً دوسری قسم کے شاعر تھے انھیں تنہا شاعر نہیں کہا جا سکتا، وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، نثار بھی تھے اور لغوی بھی، انھیں زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل تھی اور عروض و قوافی کے بھی وہ پورے ماہر تھے، ان حالات میں صرف شعر و شاعری پر وہ مدار رکھ کے اپنے دواوین کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوتے تو بعض نایاب و کار آمد کتابیں جو انھوں نے لکھیں زیورِ طباعت سے محروم ہو کر لوگوں کی نظروں سے آج اوجھل ہوتیں، مولانا کے بعض احباب و تلامذہ نے اکثر انھیں دواوین کی اشاعت کی طرف متوجہ بھی کیا اور کچھ مدد بھی کرنی چاہی مگر مرحوم کی بے اعتنائی نے کبھی کام نہ بننے دیا، مرحوم کی وفات کے بعد ان کے دواوین برادرِ محترم سید محمد احسن صاحب کی تحویل میں محفوظ رہے، برادر موصوف کی مسلسل علالت اور دیگر تفکرات نے انھیں اتنا موقع نہیں دیا کہ ان دواوین کی اشاعت کی طرف وہ توجہ فرماتے، یہ دواوین اب پاکستان پہونچ چکے ہیں اور سُن رہا ہوں کہ برادرِ معظم جناب سید سعید احسن صاحب اس کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، موصوف یقیناً اس دیوان کو "کلیات" کی حیثیت میں پیش کریں گے

پاکستان میں اُردو کے قدردان موجود ہیں لہذا "کلیات احسن" کی وہاں اشاعت بہت مناسب رہے گی، افسوس ہندستان میں اُردو زبان بے قدری کا شکار ہے، موجودہ نسلیں اگر اُردو سے بے تعلق ہیں تو آئندہ نسلیں یقیناً اس زبان سے قطعی بے بہرہ ہوں گی ایسی صورت میں اُردو زبان کی کوئی ضخیم کتاب بھارت میں شائع کرنا ناعاقبت اندیشی کے سوا کچھ نہیں، میں اسی ردوکد میں تھا کہ ایک روز میرے ایک دوست بابو ویرندر پرشاد سکسینہ نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ چند سالوں میں کئی کتابیں شائع کرا چکے ہیں، آپ نے کبھی اپنے والد کے دیوان کی طرف توجہ نہیں کی، حالانکہ یہ کوئی ایسی مشکل بات بھی نہیں، بابو ویرندر پرشاد کے اس سوال نے ان جذبات کو جھنجوڑ ڈالا جو فطرتاً ایک خلف اپنے دل میں اپنے والد کے لئے رکھ سکتا ہے، میں اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن دوسرے روز سے ہی والد مرحوم کے کلام کو جمع کرنے میں مصروف ہو گیا، اپنے پاس والے مسودے ٹٹولے اور ان سے مجھے مولانا مرحوم کا معتد بہ کلام دستیاب ہو گیا کلام کے اچھی تعداد میں دستیاب ہو جانے کے باوجود یہ خیال دماغ میں بدستور قائم تھا کہ بھارت کے موجودہ مذاق کے پیش نظر مولانا مرحوم کا پورا دیوان شائع کرنا ٹھیک نہیں رہے گا، غور کرتا رہا بالآخر یہ رائے قرار دی کہ ان کا کچھ کلام مع ان کی مختصر سوانح عمری کے شائع کر دیا جائے۔ اس میں مصارف بھی کم ہوں گے اور اس مختصر کو پڑھنے کے لئے لوگ اپنے مصروف اوقات سے کچھ وقت بھی دے سکیں گے۔ میرے ایک محترم بھائی کا یہ بھی خیال تھا کہ مولانا مرحوم کا صرف کلّیات شائع ہو، مختصر و منتخب مجموعہ غیر مناسب رہے گا، لیکن اس خیال سے میں متفق نہیں ہوا۔ اس مختصر کی اشاعت سے

کلیات پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، میں اگر مولانا مرحوم کا یہ مختصر مجموعۂ کلام شائع کر رہا ہوں تو مرحوم کے اعقاب میں جس کو توفیق ہو وہ اُن کا کلیات شائع کر دے، اس مختصر میں اگر خوبیاں ہوں گی تو کلیات کے لئے اور زیادہ راستہ صاف ہو جائے گا اور لوگ اس مختصر سے زیادہ کلیات میں دلچسپی لیں گے اور پھر اس ارشادِ ربانی پر بھی تو نظر رکھنا لازم ہے کہ فوقَ کُلِّ ذِی عِلمٍ عَلِیم یعنی ترقی کی گنجایش ہمیشہ باقی رہتی ہے

اس مجموعۂ کلام میں مولانا مرحوم کا ہر قسم کا کلام پیش کر دیا گیا ہے، تقریباً سو غزلیں ہیں اور کم و بیش اسی قدر دوسرے اصنافِ سخن پر کلام ہے، اسی ترتیب سے یقیناً یہ مختصر مجموعۂ کلام اس امر کی وضاحت کر دے گا کہ مولانا مرحوم ہر نوع اور ہر قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے تھے، ان کے دل و دماغ کیا غزل اور کیا قصیدہ، کیا قطعہ اور کیا مسدس، کیا مثنوی اور کیا مرثیہ، ہر صنفِ شعر کے لئے موزوں اور تر و تازہ تھے۔ اکثر چیزیں اس مجموعہ میں معمولی اور بے موقع محسوس ہوں گی لیکن میں نے انکی اشاعت اس لئے ضروری متصور کی کہ مولانا مرحوم کے ہر قسم کے کلام کا ایک مختصر خاکہ ذہن میں قائم ہو سکے ورنہ یہ تو حقیقت ہے کہ ان کی تمام شاعرانہ بلند پروازیوں کا اندازہ ان کے "کلیات" کو دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے،

اس مجموعے کی ترتیب کے سلسلے میں جیسا کہ قاعدہ ہے مجھے کچھ تکلیف دہ تجربات بھی ہوئے، آپ غالباً یہ سُن کر تعجب کریں گے کہ اگر میرے پاس ذخیرہ نہ ہوتا تو میں شاید مولانا مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کے سلسلہ میں ایک لفظ نہ لکھ سکتا، اس سلسلے میں صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ مجھے اس مجموعۂ کلام کی ترتیب میں کوئی بیرونی مدد نہیں ملی، بیشتر غزلیں اور نظمیں مولانا مرحوم کے لکھے ہوئے اُن مسودات سے مجھے حاصل ہوئیں جو یقیناً نقشِ اوّل کے مصداق ہیں، انھیں

مسودات سے ان کا کلام نقل ہو کر متفرق رسائل میں شائع ہوتا رہا، یقین ہے کہ مرحوم نے بعض غزلوں اور نظموں میں لفظی ردّ و بدل اور ترمیم بھی کی ہوگی، افسوس بعض غزلوں اور نظموں کا میں مطبوعہ غزلوں اور نظموں سے مقابلہ بھی نہیں کر سکا کچھ کلام اس مجموعہ میں ایسا بھی ہے جو مولانا کی رواں اور پنسل سے لکھی ہوئی تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے لہٰذا لفظی تفاوت کا امکان ہے اور اسے میری بے بضاعتی اور کم علمی پر دلیل بنایا جا سکتا ہے، کچھ کلام ایسا ضرور ہے جو میں نے مطبوعہ کلام سے مقابلہ کر کے پیش کیا ہے ورنہ اس کتاب میں کل کلام میرے پاس والے قلمی مسودات سے ماخوذ ہے۔

مولانا مرحوم کے کلام کا تجزیہ کرنا، اس کے محاسن گنانا اور خوبیوں پر آپ کو متوجہ کرنا میرا کام نہیں ہے، اتنا بہرحال کہنا ہی پڑتا ہے کہ مولانا مرحوم کی غزلیات میں جو رنگ عام طور سے آپ محسوس کریں گے وہ خود اختیاری تھا، وہ دانستہ اُستاد کے رنگ سے قطع نظر نہیں کرتے تھے ورنہ ان کا خاصا کلام اس نوعیت کا بھی ہے جس میں موجودہ رجحانات بدرجۂ اتم موجود ہیں اور مولانا اس رنگِ سخن میں کامیاب بھی رہے ہیں، داغ کے رنگ میں جو کچھ کہا گیا ہے محض تقلید کی شورا شوری میں مولانا کافی آگے نکل گئے ہیں اور ان کی ایسی شاعری کا رنگ کافی شوخ، بے باک اور بے محابا ہو گیا ہے، داغ عملی انسان تھے انھوں نے عشق و محبت کے رموز جو اشعار کی شکل میں پیش کئے ہیں وہ تجربہ کی چیزیں ہیں اور عملی تاثرات ہیں چنانچہ ان کے اشعار میں عام بے باکی و شوخی کے باوجود چسک ہے لیکن پیروں اور ولیوں کے گھر پیدا ہونے والا ایک شاگرد یہ بات کہاں پیدا کر سکتا تھا، مولانا احسن کی تمام عمر زبان و ادب کی گتھیاں سلجھانے آدابِ شعر اور طریق زبان کو سمجھانے اور اُردو زبان کو صحیح راستے اور ڈگر پر

چلانے میں گزری، ظاہر ہے ایک انسان کسی ایک ہی فن میں کامل اور ماہر ہو سکتا ہے مولانا اُستاد تھے اور مسلم الثبوت اُستاد لہٰذا اُن کا ہر شعر زبان اور بیان کی کسوٹی پر تو پورا اُتر سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے بطون میں وہ کیفیات بھی سموئی ہوئی ہوں جو اسی کے اشعار میں پیدا ہو سکتی ہیں جس نے بام و بازار کی سیر کی ہو جسے عشق و ہوس کی دُنیا سے سابقہ پڑا ہو، جس نے ہجر و فراق کی سختیاں جھیلی ہوں اور جو جدائی کی اذیت میں مبتلا رہا ہو۔

غزل کے مقابلے میں مولانا نظم میں بہت تیز دست تھے، ان کی نظموں میں آمد ہی آمد ہوتی ہے آورد کا نام نہیں، افسوس اس مختصر ہی میں ان کی بعض معرکے کی نظمیں محض طویل ہونے کی بنا پر نہیں دے سکا۔ مولانا کے کلام کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں عربی و فارسی کے ایسے ایسے وجیہہ اور گھمبیر الفاظ ایسی برجستگی سے استعمال کئے ہیں کہ سماعت پر ذرا بھی بار نہیں ڈالتے، بڑے بڑے مرعوب کن الفاظ تو آپ کو بیشتر شعرار کے کلام میں ملیں گے لیکن ایسے الفاظ نے مولانا کے یہاں جو برجستگی حاصل کر لی ہے وہ آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔

جہاں تک میری سمجھ اور میری اہلیت نے میرا ساتھ دیا ہے میں نے اس مختصر میں مولانا مرحوم کا نہ صرف چوٹی کا کلام پیش کر دیا ہے بلکہ ہر نوع کا کچھ نہ کچھ کلام اس مجموعہ میں ملے گا۔ اس طرح اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے جو مولانا مرحوم کے مجموعہ کلام کے شائع ہونے سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔

میں نے اس کتاب میں اپنے بعض "کرم فرماؤں" کا ذکر ذرا "بے تکلفی" سے کر دیا ہے، اس کی ضرورت بھی تھی، اگر ایسا نہ کرتا تو صاحب کتاب کے

"دوست و دشمن" میں آپ تمیز کیسے کر سکتے۔ بہر حال اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں بہت سی وہ غلط فہمیاں میں نے دُور کر دی ہیں جو میرے کرم فرماؤں نے پیدا کر دی تھیں۔

سید رفیق مارہروی

بدایوں

۱۰ ستمبر ۱۹۶۰ء

تذکرۂ احسنؔ

بعض شہر اور قصبے ایسے ہوتے ہیں جن کی خصوصیات کی بنا پر افراد پہچانے جاتے ہیں حالانکہ اُن افراد میں بذات خود کوئی خوبی نہیں ہوتی۔ دہلی اور لکھنؤ کا ایک شخص صرف اس بنا پر کہ وہ دہلی اور لکھنؤ جیسے معروف و مشہور شہر کا رہنے والا ہے دوسروں سے ممتاز خیال کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح بعض گم نام شہر اور قصبے اگرچہ خود کوئی جاذبیت اور خصوصیت نہیں رکھتے لیکن وہاں کے بعض افراد کے ذاتی محاسن کی بنا پر وہ پہچانے اور جانے جاتے ہیں، جب کبھی ایسے شہروں کے نام زبان پر آتے ہیں دماغ کے پردے پر اُس فرد یا افراد کے نام مرتسم ہو جاتے ہیں جن کی نام آوری کی بنا پر اُن شہروں کو شہرت نصیب ہوئی، اجمیر کا نام زبان پر آتے ہی کون ہے جسکے ذہن و دماغ میں خواجہ اجمیریؒ کا تصور پیدا نہیں ہو جاتا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اجمیر کی ساری شہرت حضرت خواجہؒ کے روحانی کمالات کی رہینِ منّت ہے، آگرے کا جب ذکر آتا ہے فوراً دل و دماغ میں "تاج محل" کا تصور قائم ہو کر اسکے بانی کے جبروت و سطوت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور شاہانِ سلف کی یاد دلوں میں تر و تازہ ہو جاتی ہے ــــــــ بالکل اسی طرح "مارہرہ" جیسے غیر معروف اور چھوٹے سے قصبے کا ذکر آتے ہی سب سے پہلے جو نام دماغ میں گردش کرتا ہے وہ حضرت احسنؔ مارہروی کا ہے، گو مارہرہ کو اور خصوص میں بھی شہرت حاصل ہے وہاں ایک بہت بلند مرتبت صوفی بزرگ حضرت سید شاہ برکت اللہؒ کی درگاہ ہے

اللہ والے اور صوفیانہ دل و دماغ رکھنے والے مارہرہ کو انھیں بزرگ کے نام سے پہچانتے ہیں، مارہرہ کے بعض اور بھی افراد دُنیاوی عزّ و جاہ کے اعتبار سے شہرت رکھتے تھے لیکن جہاں تک علم دوست اور شعر پرست افراد کا تعلق ہے شاید ہی کوئی ہو جس کے ذہن میں مارہرہ کا نام آتے ہی حضرت احسنؔ کا تصور قائم نہ ہو۔ آیئے اس صحبت میں حضرت احسنؔ مارہروی جیسی بلند مرتبت ہستی کا آپ بھی کچھ ذکر سُن لیجئے :۔

پیدائش :۔

مارہرہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، مولانا احسنؔ مارہروی اسی قصبے میں ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ میں تولد ہوئے، خاندان میں علم و فضل کے چرچے تھے، ہر شخص صاحب فضل و کمال تھا، مولانا باپ کی تنہا اولاد تھے اُن کی ولادت پر ہر نوع کی خوشیاں منائی گئیں، بعض افراد خاندان نے آپ کی ولادت کی خوشی میں قطعات تاریخ کہے، مولانا کے والد حضرت سید شاہ مجتبیٰ حسنؔ[۱] صاحب نے جو قطعات تاریخ فرمائے انھیں یہاں لکھے بغیر آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا، ملاحظہ ہوں۔

شکر صد شکر کہ خلّاقِ جہاں   دادہ فرزند ثریا اجلال
بہرِ تاریخ بصنع نادر   گو نہیں نیّر جاہ و اقبال ۱۲۹۳

دو قطعات فصلی سنوں میں بھی حسنؔ مرحوم نے فرمائے تھے وہ بھی ملاحظہ ہوں :۔

عطا کرد مارا چو پورِ خجستہ   کنم شکر بے حد جناب خدارا
حسنؔ بہر تاریخ فصلی قلم   رقم زد گلِ نوز نخل تمنا
کنم شکر خدائے پاک بیجا   کہ بخشیدہ مرا فرزند خوشحال ۱۲۸۴ف

---

[۱] سید شاہ مجتبیٰ حسن صاحب مرحوم اچھے شاعر تھے ان کا فارسی، عربی اور اُردو کلام میرے پاس محفوظ ہے، مجردہ بالا قطعات برمحل ہونے کی بنا پر یہاں پیش کر رہا ہوں۔

حسن کلکم رقسم زد سال فصلی گگلئے نواز ریاض جاہ و اقبال
۱۲۸۴ ف

تعلیم و تربیت:۔

مولانا احسن مارہروی نے ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مکتب میں حاصل کی۔ ۹ برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا، اس حقیقت کی یادگار بھی ایک قطعۂ تاریخ ہے، ملاحظہ ہو کس دل سوزی کے ساتھ ایک باپ اپنے بیٹے کی ترقیِ علم و اقبال کے لئے دست بہ دعا ہے

پورِ من سید علی[1] احسن حفظ قرآنِ پاک کرد آغاز
یارب ایں طفلِ روح روحم را ساز در بزم حافظاں ممتاز
دولتِ حافظہ بود ھردم قوتِ ناطقہ شود دم ساز
ھمسرِ اوج، سپہرِ علم و قبول کند ایں طائرِ ذکا پرواز
بہرِ تاریخ اے حسن فی الفور
گفت ہاتف کلامِ رب آغاز
۱۳۰۲ھ

اس قطعہ کے ذیل میں لکھا ہے :۔ کاتب السطور مجتبیٰ حسن، اس سے بھی ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ جس تمنا اور خواہش کا اظہار محررۂ بالا اشعار میں ہوا ہے وہ دُعا بن کر مقبول بارگاہِ خداوندی ہوئی اور مولانا نامور "حفاظ" کی صف میں شمار ہوئے، ۱۶۔ ۱۷ سال کی عمر تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا خاندان مرکز علم و کمال تھا، خاندان کا فرد فرد علمی حیثیت سے یگانۂ روزگار تھا۔ مولانا نے جو کچھ کہ دوسروں کو عمریں صرف کر کے حاصل کرنا پڑتا تھا ذرا سی عمر میں حاصل کر لیا، ۱۷۔ ۱۸ سال کی عمر میں والدین کے ہمراہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ حفظ قرآن پاک پر آپ کے عبور تام کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں آپ نے

---

[1] مولانا کا پورا نام سید علی احسن عرف شاہ میاں تھا۔

مسجد اقصیٰ میں بہ سلسلۂ تراویح قرآن سُنایا اور وہاں کے حفاظ اور اہلِ علم نے آپکے ذہنِ رسا کی داد دی، عرب میں ہی آپ نے قرات سیکھی، مولانا حافظ تو تھے ہی عرب پہونچکر حاجی اور قاری بھی ہو گئے۔

اجداد و خاندان:۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اودھ کے مشہور قصبہ بلگرام سے ایک بزرگ سید شاہ عبدالجلیلؒ حالتِ جذب میں وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور مارہرہ پہونچے، وزیر خاں نامی ایک کمبوہ بزرگ کو آپ سے عقیدت ہوئی اور انھوں نے آپ کے ایسے قدم پکڑے کہ پھر مارہرہ سے باہر نہ گئے، یہیں قیام فرمایا۔ آپ کے پوتے سید شاہ برکت اللہ[۱] صاحب الملقب بہ صاحب البرکات نے اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا لیا، نواب محمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد عقیدت مند ہوا، آپ کی وفات پر آپ کے مزار مبارک پر ایک خوش نما درگاہ تعمیر کرائی، ۱۲ مواضعات کی ایک جاگیر اس درگاہ اور

---

[۱] ۔ برکت اللہ صاحبؒ فارسی و عربی اور ہندی کے زبردست شاعر تھے فارسی و عربی میں عشقی تخلص فرماتے تھے، فارسی کا مجموعہ کلام حضرت احسن مارہروی نے ۱۳۱۵ھ میں "مجمع البرکات" کے نام سے شائع کر دیا تھا اس مجموعے میں دیوان عشقی، مثنوی ریاض عشق، رسالہ سوال و جواب اور عوارف ہندی شامل ہیں۔ ہندی میں "پیم پرکاش" کے نام سے ایک مجموعہ خاندانی تبرک کے طور سے محفوظ تھا جس کو ۱۹۴۳ء میں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کے پروفیسر لچھمی دھر نے اردو، ہندی اور انگریزی تین رسم الخطوں میں ایک اچھے مقدمہ کے ساتھ شایع کر دیا ہے۔ حضرت برکت اللہ صاحب کا ہندی کلام دیکھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ اورنگ زیب کے بدنام زمانہ حکومت میں ایک مسلمان صوفی کس جذبۂ اخوت کے تحت ہندی اور سنسکرت کی طرف راغب ہوا تھا، کاش عالمگیر کو بدنام کرنے والے اس حقیقت کی روح پر غور کریں۔

آل واولاد کے مصارف واخراجات کے لئے وقف کے علاوہ نواب مذکور کے احمد شاہ وغیرہ کی جانب سے بھی کچھ مواضعات معافی عطا ہوئے اور اس طرح خاندانِ برکات جو روحانی خصائص میں تو کمال رکھتا ہی تھا مادی واقتصادی اعتبار سے بھی مضبوط ومستحکم ہوگیا، ایسے حالات پیدا ہوجانے کے بعد خاندان برکات کیلئے صرف دو کام تھے اللہ اللہ کرنا یا دریائے علم وفضل کی شناوری کرنا، چنانچہ اس خاندان نے وہ شہرت پائی کہ اسی خاندان کے بعض صوفیار[1] کے دروازوں پر بڑوں بڑوں نے سرِ نیازمندی جھکایا، علم وفضل کے اعتبار سے خاندان میں اس پائے کے بزرگ پیدا ہوئے کہ جناب غالب[2] کو ہمیشہ اُن کی آستاں بوسی کا ذوق وشوق رہا، کچھ نسلیں گزرنے کے بعد اسی خاندانِ برکات میں اختلافات پیدا ہوگئے اور حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحبؒ کی اولاد دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، قدیم مکانات واملاک اور جائداد کے دو حصے ہوگئے، بڑے بھائی کے حصہ املاک کو لوگ سرکارِ کلاں یعنی بڑی سرکار کے نام سے پکارنے لگے اور جن مکانات پر چھوٹے بھائی نے قیام فرمایا اُسے سرکار خورد یعنی چھوٹی سرکار کا نام دیا گیا، یہ دونوں سرکاریں آج تک قائم ہیں، سابقہ سطوت اور شان گو ختم ہوچکی ہے لیکن ان

لہ۔ ایسے باکمال بزرگوں میں سب سے نمایاں نام حضرت اچھے میاںؒ صاحب کا ہے جو اس خاندان میں بڑے نامور صاحبِ طریقت بزرگ گذرے ہیں، اس خاندان کے حضرت اچھے میاں صاحبؒ آخری صاحبِ ولایت بزرگ تھے، ان کے بعد آج تک انھیں کے واسطے اور حوالے سے اس خاندان کے کئی فرد نام نہاد "پیر فقیر" بنے ہوئے اپنے کاروبار کو جمکائے ہوئے ہیں،

لہ۔ غالب کے مجموہائے خطوط میں آپ کو صاحبِ عالم اور شاہ عالم صاحب کے نام ملیں گے، یہ باپ بیٹے جس علمی فضیلت اور برتری کے حامل تھے اسکا اندازہ کرنے کیلئے غالب کے خطوط ملاحظہ کیجئے، ان خطوط میں غالب جیسا نخوت پسند ادب سے سر جھکائے نظر آتا ہے۔

سرکاروں کی حدود اور کھنڈرات اب تک خاندانِ سادات کی بزرگی اور جبروت پر گواہی دے رہے ہیں۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ایک ہی فرد کے خون و پوست سے زندگیاں پانے والے یہ دونوں خاندان ایک فطرت اور ایک نوع کے اطوار رکھنے کے بجائے دو مختلف خصائص کے حامل ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے مکانات واملاک کی تقسیم کی طرح اپنے اجداد کی عادات وخصلات اور ان کی جبلت وفطرت کو بھی آپس میں تقسیم کر لیا ہے، لوازماتِ پیری و مریدی کے دوش بدوش علم وفضل کے چرچے اس خاندان میں شروع سے رہے ان دو مختلف محاسن کے پیش نظر سرکار کلاں والوں نے اجداد کے سجادۂ طریقت پر قبضہ کیا اور اپنے اجداد کے مسلک پر قائم ہو گئے اس میراث پر وہ اس مضبوطی سے آجتک قائم ہیں کہ وہاں اگر مرغی کا بچہ بھی انڈے سے نکلتا ہے تو پیر فقیر کی شان لئے ہوئے ہوتا ہے، ان کے اجداد صوفی منش اور صاحبِ ولایت تھے۔ گو ولایت اور بزرگی حضرت سید شاہ اچھے میاں صاحبؒ پر ختم ہو چکی لیکن اس خاندان کے لوگ اسی ڈگر پر لکیر کے فقیر کی طرح ابتک قائم ہیں، اور سجادۂ برکاتیہ عالیہ کی رونق قائم کئے ہوئے ہیں، سرکار خورد والے شروع سے پیری مریدی کے جھگڑوں سے دور رہے گو اس خاندان کے بھی ایک صاحب اس ڈگر پر چلے لیکن وہ چونکہ اس کام کے لئے نہ ازل سے ہوئے تھے اور نہ موزوں تھے لہٰذا آخر عمر تک ناکامیاب ونامراد رہے، اس خاندان کی روایات علم وفضل کے حصول سے ہمیشہ ہم ردیف رہیں، سرکار خورد کے بزرگوں نے علم وفضل میں کمال حاصل کرنے میں ہمیشہ تگ ودو کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر زمانے میں اس خاندان کے اندر بڑے بڑے عالم، نامی گرامی حفاظ اور مستند لغوی گزرے، علما، فضلا، حکما، و شعرا کا یہ سلسلہ اس

امتیاز اور تفوق کے ساتھ اس خاندان میں جاری رہا کہ سرکار کلاں میں تو حضرت سید شاہ اچھے میاں صاحبؒ کے بعد ولایت ختم ہو گئی اور سلسلۂ طریقت برائے نام رہ گیا لیکن سرکار خورد میں صاحبِ کمال افراد کا جو سلسلہ حضرت سید شاہ نجات اللہ صاحبؒ سے شروع ہوا تھا وہ حضرت صاحب عالم، شاہ عالم، نور عالم، ہٹو میاں، بالے میاں وغیرہ سے گزرتا ہوا مولانا احسن مارہروی پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ آج بھی سوامی مارہرویؒ کے وجود سے یہ سلسلہ قائم ہے، میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ بڑی سرکار والے علم و دانش سے قطعی معرّا تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہاں کے لوگوں نے پیری و مریدی کے مقابلے میں علم و ادب اور حکمت و شعر کی طرف توجہ نہیں کی، جس طرح کہ سرکار خورد میں ایک صاحبِ علم و فضل سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر پیری و مریدی کی طرف راغب اور مائل ہو گئے بالکل اسی طرح سرکارِ کلاں میں بھی دو ایک بزرگ ایسے گزرے جنھوں نے پیری مریدی میں اپنی نااہلی کو محسوس کر کے علم و فضل کی طرف توجہ کی، ایسے لوگوں میں سید آل عبا صاحب کی ایک ذات پیش کی جا سکتی ہے جو دنیائے ادب میں "آوارہ" کے نام سے پہچانے جاتے ہیں ان کے والد بھی صاحبِ علم و فضل تھے اور یہ خود بھی اچھے اور پسندیدہ انشار پرداز ہیں۔

خاندانِ برکات کے افراد نے علم و فضل میں کمال بتا حر رکھنے کے باوجود کبھی خودنمائی کو پسند نہیں کیا، شہرت سے گریزاں رہے، ہمیشہ گوشہ نشین رہے لیکن زمانہ بدل چکا تھا، مولانا احسن مارہروی نے بھی گمنامی اور گوشہ نشینی کو پسند کیا مگر

لہ۔ سید سرور عالم نام، سوامی تخلص، بہترین شاعر ہیں، اپنے جد اعلیٰ کی تقلید میں ہندی بھاشا میں شاعری کرتے ہیں، سوامی درشن کے نام سے مجموعہ شائع ہو چکا ہے، گورنمنٹ سے ڈھائی سو روپیہ انعام ملا ہے اور ایک قدردان سو روپیہ ماہوار اعزازاً دیا کرتے ہیں۔

ذرائع رسل و رسائل کی ترقی نیز زمانہ کی تبدیلی نے مولانا کی گوشہ گمنامی سے باہر کر ڈالا اور مولانا اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جن کے کمالات شعری و علمی نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی ہے۔ اور آج مارہرہ اُن سے عبارت ہے۔

ابتدائے شاعری :۔

شاعری کا ذوق مولانا احسن مارہروی کو فطری تھا۔ وہ کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، مولانا مرحوم کا کچھ ایسا کلام بھی نظر سے میری گذرا ہے جو موصوف نے غالباً ۱۴-۱۵ سال کی عمر میں کہا تھا لیکن اُن کے ایسے کلام کو تصنیفی حیثیت نہیں دی جا سکتی، صرف یہ اندازہ ممکن ہے کہ انھوں نے کم عمری میں شعر کہنے شروع کر دئے تھے، باقاعدہ شاعری انھوں نے ۱۸ سال کی عمر سے شروع کی۔ اس حقیقت کے جواز میں میرے پاس بعض قطعات تاریخی محفوظ ہیں جو مرحوم نے اپنے والدِ بزرگوار کی وفات پر فرمائے، ایسے قطعات کی تعداد خاصی ہے، مولانا نے ان قطعاتِ تاریخی کے مجموعہ کا نام "تواریخ حُزن و بُکا" رکھا تھا جس سے ۱۳۱۱ھ برآمد ہوتے ہیں، اس قلمی بیاض کے سرِ ورق ایک قطعہ بہ صنعتِ نادر تحریر ہے جس کے مصرعوں سے ہجری، فصلی، عیسوی اور بکرمی سال برآمد ہوتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

زفوتِ پدر آہ دیوان او — نوشتم تواریخ حُزن و بُکا
علی احسن از بہر نام و نشش — بگفتم تواریخ حُزن و بُکا

ایک قطعہ اور ملاحظہ ہو:۔

کرد جنابِ پدرم ناگہاں — عزم ز دنیا بسرائے بقا
در غم آں قبلۂ عالم پناہ — مبتلا گشتہ خویش و اقربا
در سنہ ماضیہ با اہل و عیال — کرد ادا حج بصد التجا

آہ پس حج و زیارتِ او | آمدہ در بمبئی واحسرتا
رختِ سفر بست ز دنیائے دوں | ہیچ نماندہ بجز آہ و بکا
در حقِ آں صاحبِ جود و کرم | ہست ز اخلاقِ جہاں ایں دعا
باد بفردوسِ بریں جائے او | از کرم صاحبِ لطف و عطا
روزِ قیامت بحساب و کتاب | بخش ہمیں است بتو التجا

احسنِ مضطر پئے تاریخ گفت
۱۳۰۱ھ
آہ بفرمود ز دُنیا قضا

والد کے وفات پا جانے کے بعد چھوٹی سی عمر میں مولانا کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ پڑ گیا، اتفاق سے ایک بزرگ خاندان موجود تھے لہذا جبتک وہ زندہ رہے مولانا کو کسی خاص پریشانی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑا، رات دن شعر و شاعری کے چرچے رہتے تھے اور شب و روز ادب و شعر کی گتھیاں سلجھائی جاتی تھیں اسی زمانہ میں مولانا احسن مارہروی نے "ریاض سخن" کے نام سے ایک گلدستہ نکالا، اس میں ہم طرحی غزلیں شایع ہوتی تھیں، جذبہ سخن جب زیادہ ترقی پذیر ہوا تو ۱۸۹۶ء میں مولانا نے حضرت داغ سے تلمذ حاصل کیا، یہ تلمذ خط کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا، اس حقیقت کے جواز میں مولانا مرحوم کا سب سے پہلا خط داغ کے نام ملاحظہ ہو:-

عالی جاہا!- میں ایک مشہور قصبہ مارہرہ کا رہنے والا ہوں۔ ہمیشہ سے آپ کا کلام دیکھنے کا شوق رہا اب تقضا ابطبع میں نے بھی کچھ کہنا شروع کر دیا ہے مگر بے اصلاحِ اُستاد شعر گوئی کس مصرف کی ہے

شعر گوئی اگرچہ آساں ہے
لیکن اُستاد کی ضرورت ہے

اگرچہ مجھ سے ہیچ میرز کا کلام ایسا نہیں ہے جسے آپ سے اُستاد دیکھیں
مگر میں نے یہ خیال کر کے کہ ؎ "خاک از تودہ کلاں بردار"
ونیز ؎ تری آتش بیانی داغ روشن ہے زمانے پر
پگھل جاتا ہے مثل شمع دل ہر اک سخنداں کا
اُمیدوار ہوں کہ مجکو بھی حلقہ بگوشوں میں داخل کیجیے اور سرفراز فرمایئے۔
(۲۷ر جون ۱۸۹۶ء از زبان داغ)

حضرت داغ نے جو جواب دیا وہ بھی ملاحظہ ہو:۔
آپ کا نام شاگردوں میں لکھا گیا، اطمینان رکھیئے، ڈاکٹر مہدی حسن صاحب نے تاریخ گوئی میں کتاب لکھی ہے، ضرور منگایئے۔
داغ دہلوی۔ ۵ر اگست ۱۸۹۶ء

تین چار سال تک حضرت احسن نے اُستاد سے ذریعہ خط و کتابت اصلاح لی" ریاض سخن" اب داغ اور داغ کے شاگردوں کے کلام پر محمول ہو کر رہ گیا تھا بڑے بڑے معرکے کی غزلیں اس رسالے میں شایع ہونے لگیں، چاروں طرف قدردان پیدا ہو گئے۔ والیٔ ٹونک تک رسالے کی رسائی ہوئی اور مضطر صاحب خیرآبادی کی توجہ سے کچھ انعام بھی دیا جانا قرار پایا مولانا نے اس قدردانی کے جواب میں رسالہ کا نام ریاض سخن کے بجائے ریاض خلیل کر دیا یہ رسالہ کئی سال تک دو مختلف ناموں سے شائع ہوتا رہا اور اس طرح مولانا کے اس شوق نے مولانا کی آبائی جائداد پر اثر ڈالا اور وہ کافی زیربار ہو گئے۔ رسالہ یک یک بند ہو گیا، مولانا کے ذوق و شوق اور دل جوئی کا سامان درہم برہم ہو گیا۔ ذوق شعری پوری طرح دل و دماغ پر طاری تھا، اُستاد سے ذریعہ خط و کتابت استفادہ فرماتے تھے مگر اس سے دل مطمئن نہ تھا ادھر جائداد کے زیربار ہو جانے

سے پریشانی تھی، اپنی جائداد بزرگِ خاندان سید برکات حسن صاحب کے انتظام وانصرام میں دے کر مولانا حیدر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔

حیدر آباد کا سفر:-

اگست ۱۸۹۶ء میں مولانا حیدر آباد پہونچے اُستاد سے پہلی ملاقات کا ذکر مولانا نے اس طرح فرمایا ہے:-

"جب میں اپنے ہم زلف سید کاظم علی صاحب شوکت بلگرامی کے ساتھ جو دار الشفا حیدر آباد میں رہتے تھے۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی خدمت میں شرفِ قدم بوسی حاصل کرنے کے لئے پہلی بار حاضر ہوا تو میرے دل کا عجب حال تھا، مرزا صاحب سے فیض تلمذ کو دو تین سال گزر چکے تھے اور ذریعہ خط و کتابت طرفین میں خاصا تعلق اور واقفیت تھی لیکن صوری ملاقات کا یہ پہلا اتفاق تھا، دل دھڑک رہا تھا اور اشتیاقِ قدم بوسی میں بے اختیار ہوا جاتا تھا، اُستاد کا قیام افضل گنج میں تھا، ہم لوگ صبح ۸ بجے پہونچے، اطلاع کرائی گئی فوراً طلب ہوئے اس وقت مرزا صاحب کے پاس دو شخص اور بیٹھے ہوئے تھے ایک میر حسن علی خاں اور دوسرے بارق صاحب، بڑی محبت سے اُستاد نے ہمیں لیا۔ مجھے دیکھ کر بہ یک نظر پہچان لیا، سلام و جواب کے بعد پہلا جملہ جو زبانِ اُستاد سے ادا ہوا وہ یہ تھا۔

"اب تو آپ مسلمان کی صورت نظر آتے ہیں"۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دفعہ آگرے میں برادرم شوکت بلگرامی کے ہمراہ انھیں کے لباس یعنی سوٹ بوٹ میں میں نے تصویر کھنچوائی تھی اور اس فوٹو کی ایک کاپی اُستاد کی خدمت میں بھی بھیجی

تھی جو ایک ہفتے کے بعد ہی مجھے اس تحریر کے ساتھ واپس ملی کہ :-
"میں ایک سید حافظ اور حاجی کو اس شکل میں دیکھنا نہیں چاہتا۔" گو میری تصویر ایک نظر دیکھ کر واپس کر دی گئی تھی لیکن جب ملاقات ہوئی تو مرزا صاحب نے پہلی نظر میں مجھے پہچان لیا۔ شوکت بلگرامی سے مرزا صاحب پہلے سے واقف تھے بولے کہ آپ لوگوں سے آج مل کر بہت مسرت ہوئی احسن صاحب نے اپنی آمد سے مطلع تو ضرور فرمایا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے پاس ہی ٹھہریں گے لیکن مجھے شوکت صاحب سے بہت شکایت ہے کہ انھوں نے میرے مہمان کو مجھ سے چھین لیا، دیر تک باتیں کرتے رہے اور حالات پوچھتے رہے، جب میں نے رخصت ہونا چاہا تو حکم ہوا کہ کھانا کھانے کا وقت ہو گیا ہے کھانا کھا کر تشریف لے جائیے گا، الغرض میں اُس روز کا کھانا کھا کر قیام گاہ واپس ہوا (بزم داغ صفحہ ۲۱)

مولانا احسن مارہروی کے زمانہ قیام حیدر آباد کو اُن کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، شاعری کا ابتدائی دور فنِ شعر سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کا زور و شور، داغ جیسے مرنجانِ مرنج اُستاد کے فیوض اور پھر احسن جیسا شاگرد شب و رُوز داغ کی خدمت میں حاضر رہ کر انھوں نے پورا پورا استفادہ حاصل کیا، اُستاد کے الطاف و اشفاق نے مولانا احسن کے دل میں اُستاد کی کچھ ایسی قدر پیدا کر دی کہ آپ فنا فی الاُستاد ہو کر رہ گئے، اُستاد کی محبت اور لگن جو حیدر آباد کی رہائش نے اُن کے دل میں پیدا کی تھی وہ اُن کی زندگی کے آخری لمحات تک اُن سے جُدا نہ ہوئی، انھوں نے حیدر آباد کے دورانِ قیام میں داغ کے دوسرے شاگردوں کی طرح "نشستند و گفتند و برخاستند" کے مصداق زندگی

نہیں گذاری بلکہ کچھ ایسے کام بھی کئے جن کو علمی و ادبی افادیت کے اعتبار سے صاحب ذوق آجتک سراہتے ہیں، داغ اپنی صفائی زبان اور قوت بیانیہ کے اعتبار سے اپنے ہم عصر شعراء میں جو درجہ رکھتے تھے وہ روشن ہے۔ دہلوی ہونے کی بنا پر ان کی زبان مستند خیال کی جاتی تھی، داغ کے اشعار، زبان و بیان اور استعمالِ محاورات کے اعتبار سے آجتک مستند مانے جاتے ہیں اور اسناد میں پیش کئے جاتے ہیں، مولانا احسن مارہروی نے آج سے نصف صدی پیشتر محسوس کیا کہ ایک ایسے قادر الکلام شاعر کے اشعار کی سند پر اگر ایک لغت تیار ہو جائے تو ادبی دُنیا کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو جائے، انھوں نے اُستاد سے مشورہ کیا، اُستاد نے صاد کیا اور مولانا نے فوراً فصیح اللغات کی بنیاد ڈال دی، روزانہ خالی اوقات میں چند الفاظ و محاورات اُستاد کی خدمت میں پیش ہوتے اور اُستاد ان پر برجستہ اشعار فرما دیتے، سند کے اشعار کے لئے اُستاد کے کلام کی چھان بین کی گئی، احسن صاحب مارہروی لغت میں دیئے جانے والے اشعار پر تشریحی و توضیحی نوٹ تحریر فرماتے، یہ سلسلہ مدت تک جاری رہا مولانا احسن کی واپسیٔ وطن کی بنا پر تعویق میں پڑ گیا اور یہ لغت چند اجزاء سے آگے نہ بڑھ سکی اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو اُردو ادب اور دُنیائے نعت میں اس کو گرانمایہ چیز متصور کیا جاتا، چند اجزاء اس کے شائع بھی ہوئے، کچھ قلمی و غیر مطبوعہ اجزا میرے پاس بھی محفوظ ہیں لیکن اس زمانہ میں اس کے قدردان اُنگلیوں پر گنے جاتے ہیں، ایسے حالات میں ان باقی ماندہ لغت کے اوراق کو طبع و شائع کرنا بے سود رہے گا میرے اس خیال کی تائید میں ایک مثال ملاحظہ ہو۔

برادرم جناب تمکین صاحب کاظمی داغ کے پرستاروں میں سے ہیں انھوں نے ابھی کچھ روز ہوئے داغ پر ایک تذکرہ شائع کروایا ہے، اس تذکرے میں مجھ بدنصیب

بہت غیر شائستہ انداز میں تسبب ستم فرمایا ہے موصوف میرے قدیم کرم فرما ہیں، عمر اور حیثیت کے اعتبار سے میرے اور ان کے حالات متوازن ہو سکتے ہیں لہذا مجھے انھوں نے جس قدر بھی بُرا بھلا کہا ہے "قدیم محبت" کی بنا پر ہو کمکر ٹالا جا سکتا ہے کہ سہ

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بد مزا نہ ہوا

مگر اسی ذیل میں انھوں نے جو مولانا احسن مارہروی کو جنھیں وہ عم معظم کہتے تھے اور بڑا ادب کرتے تھے، ملعون فرمایا ہے وہ میرے لئے یقیناً بہت دل شکن ہے اور پھر چونکہ اس مختصر میں مولانا مرحوم کی زندگی کے تمام حالات و واقعات پر بقدر ضرورت بحث کی گئی ہے لہذا میرے لئے لازمی ہو گیا کہ تمکین صاحب کی بعض غلط فہمیوں کو قطع نظر اس کے کہ انھوں نے کس قدر تلخ و تند اور غیر شائستہ الفاظ مولانا کے لئے استعمال کئے ہیں نہایت سنجیدہ و معتدل الفاظ میں دور کر دوں۔

ان کی ایک تحریر ملاحظہ ہو:-

"احسن مارہروی ۱۸۹۶ء میں خط کے ذریعہ داغ کے شاگرد ہوئے تھے وہ اپنے چچا افتخار عالم کے ساتھ بہ تلاشِ روزگار حیدرآباد پہونچے اور داغ پر مسلط ہو گئے، احسن مارہروی نے داغ کو فصیح اللغات کے چکر میں اور پھر جلوۂ داغ کے پھیر میں پھنسایا (داغ صفحہ ۱۵۹)

اس تحریر میں "بہ تلاش روزگار" "مسلط" اور "فصیح اللغات کے چکر میں اور پھر جلوۂ داغ کے پھیر میں پھنسایا" یہ سب لفظ محل نظر ہیں، تمکین صاحب کے یہ جملے غلط فہمی پر مبنی ہیں اور یقیناً اس خیال آرائی سے مولانا احسن صاحب مرحوم کی ارادت اور خلوص پر حملہ کیا ہے اور ان کی انھوں نے توہین کی ہے، آگے چل کر تمکین بھائی پھر لکھتے ہیں:-

"احسن مارہروی نے یہ اسکیم بنائی کہ کیوں نہ اس قسم کی ایک لغت مرتب کی جائے جس میں سندی شعر صرف داغ کے ہی ہوں اور اس کا نام داغ کے نام پر فصیح اللغات رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ اسکیم داغ کے سامنے پیش کی مگر داغ نے زیادہ توجہ نہ دی۔ (داغ صفحہ ۱۶۲)

اس تحریر میں "داغ نے زیادہ توجہ نہ دی" بحث طلب جملہ ہے' اور حقیقت کے قطعی خلاف ہے۔ اوپر کے دونوں حوالوں سے یہ قطعی ظاہر ہوتا ہے کہ داغ کو فصیح اللغات کی ترتیب و تالیف ناپسند تھی اور اس چکر میں مولانا احسن صاحب نے ہی ان کو پھنسانا چاہا تھا لیکن آپ کی حیرت کی انتہا نہیں رہے گی جب آپ دیکھیں گے کہ بھائی تمکین کی ہی کتاب کی ایک تحریر سے اُن کے پہلے بیان کا بطلان ہو جاتا ہے، ملاحظہ ہو:۔

داغ اس اسکیم سے بہت خوش تھے، احسن کا اس سے منشا یہ تھا کہ کام بہت لمبا چلے گا، اس سلسلے میں حیدر آباد میں مستقل قیام ہی نہ ہوگا بلکہ کوئی مستقل امداد بھی مل جائے گی اور ان کی خود بسری کے لئے کافی ہو سکے گی (داغ صفحہ ۱۶۷)

مولانا کی ترتیب دی ہوئی سوانح داغ موسومہ جلوۂ داغ کے متعلق بھی، تمکین بھائی نے غلط فہمی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں بہت سے مقامات پر یہ لکھا ہے کہ داغ نے خود مولانا احسن سے جلوۂ داغ لکھوائی، اُن کی اس نوع کی تحریروں سے ایک تحریر ملاحظہ ہو:۔

احسن کے مرتبہ حالات جو خود داغ کے لکھوائے ہوئے تھے۔ داغ روزانہ سنتے، اس میں کمی زیادتی کرتے اور اپنے خاص خاص شاگردوں سے مشورہ بھی کرتے تھے چنانچہ بیسیوں مرتبہ سننے اور کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد ایک کتاب مرتب ہوئی جس کا نام خود داغ نے جلوۂ داغ رکھا اور اشاعت کے لئے پریس کو دی گئی۔ (داغ صفحہ ۱۶۲)

تمکین صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جلوۂ داغ خود داغ نے احسن مارہروی سے لکھوائی اور خود داغ یہ فرماتے ہیں کہ :-

زندگی کے مرے احسن نے سوانح لکھے   عمر کے باغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھا
داغ نے مصرعۂ تاریخ کہا برجستہ   جلوۂ داغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھا
۱۳۲۰ھ

آگے چل کر تمکین صاحب فصیح اللغات کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"فصیح اللغات کے ۲ جزو نہایت گندے کاغذ پر بڑی ہی خراب لکھائی چھپائی سے شائع ہوئے، محمد ابراہیم خاں مالک مطبع شمسی کے پاس مدت تک فصیح اللغات کے اوراق بطور ردی پڑے رہے۔ چنانچہ میں نے بھی ایک آدھ جزو ان سے لے رکھا تھا جو ضائع ہو گیا۔ کوئی خاص بات اس میں نہیں تھی۔" داغ صفحہ ۱۶۸/۱۶۹

کوئی عیب ایسا نہیں ہو جو تمکین صاحب نے فصیح اللغات کے باب میں نہ گنایا ہو۔ فصیح اللغات جیسی کارآمد، مفید اور بے بہا کتاب کے ساتھ یہ سلوک جہاں مولانا احسن کے ساتھ زیادتی ہے وہیں اس نوع کی تنقیص سے داغ پر بھی حرف آتا ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے اس لغت کے سلسلے میں جو کدوکاوش کی، اس کی اشاعت و طباعت کے لئے مرحوم نے داغ کے توسط سے جو تگ و دو کی اس کا بڑے بڑے نکتہ داں نہ صرف اچھے الفاظ میں ذکر کرتے رہے ہیں بلکہ داد بھی دی ہے۔ مولانا احسن کا مقصد اس لغت کی ترتیب و تالیف سے نہ صرف تحقیقِ زبان تھا بلکہ اُن کی یہ کاوش اُستاد کی بے لوث خدمت سے بھی مترادف تھی لیکن افسوس آج اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھائی تمکین اس ادبی خدمات اور کارنامہ کے لئے فرماتے ہیں کہ وہ بڑے خراب کاغذ پر چھپی تھی اس کے اوراق بطور ردی پڑے رہے تھے اور کوئی خاص بات اس میں نہیں تھی۔

مولانا احسن مارہروی محض اُستاد کی ملاقات کے لئے شروع شروع میں

حیدر آباد پہونچے تھے، وہ خود صاحبِ جائداد تھے ان کو خود بسری کے لئے خدا نے سب کچھ دے رکھا تھا، حیدر آباد پہونچکر اگر انھیں کوئی معاشی صورت پیدا بھی کرنی پڑی تو یہ محض حیدر آباد کے ماحول کی بنار پر تھی جس سے خود ان کے اُستاد حضرتِ داؔغ کو برسوں پریشان وخستہ حال رہنا پڑا ورنہ ایسی صدہا مثالیں موجود ہیں کہ اہلِ کمال برسوں لوگوں کی قدر دانیوں کی بنار پر کسی ایک مقام پر خوش بسری کرتے رہے ہیں اور انھیں کس مپرسی وتنگ دستی اور عسُرت کا منھ نہ دیکھنا پڑا، مولانا احسؔن نے حیدر آباد میں رہکر خالی خولی وقت گذاری پسند نہیں کی، مفت خوری کے بجائے خود بسری کے راستے پیدا کئے اور علمی وادبی خدمت پر کمر بستہ ہوکر آذوقہ فراہم کرنا چاہا لیکن حیدر آباد کی فضا نے حسبِ ضرورت ان کی دست گیری نہیں کی، اور وہ بڑی حد تک متفکر رہے، خود حضرتِ داؔغ کی حیدر آبادی لائف کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ بے چارہ داؔغ اس وقت تک عسُرت ونامرادی کی زندگی گذارتا رہا جب تک کہ والیِ حیدر آباد اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے، داؔغ کے بُرے دنوں میں کوئی حیدر آبادی ان کا سچا ہمدرد و دمساز نہ تھا لیکن داؔغ کے دن پھرتے ہی مخلوق ان پر ٹوٹ پڑی۔ اب امیر بھی ان کے یارِ غار تھے اور غریبوں کو بھی داؔغ کی ذات کا سہارا تھا، داؔغ کے بُرے دنوں میں ایک بھی حیدر آبادی نژاد ایسا نہیں ملتا جس نے داغ کی بات پوچھنے کے طریقے سے پوچھی ہو، بے چارہ داؔغ سیکڑوں میل دور ضلع متھرا کے ایک رئیس[1] سے تو فیض اُٹھاتا رہا، دِلّی کے ساہوکا سے قرض لیتا رہا، اور بالآخر تنگ آکر اپنا دلی والا مکان بھی بیچنے پر مجبور ہوا، مگر جہاں تک اُس سرزمین کا تعلق ہے جس سے داؔغ کو لگا کر پہونچے تھے وہ "زمیں سخت

[1] کنور اعتماد علی خاں رئیس سعد آباد ضلع متھرا نے داؔغ کا اس زمانہ میں کتنا ساتھ دیا "زبانِ داغ" ملاحظہ ہو جو نسیم بکڈپو لکھنؤ نے شایع کی ہے۔

اور آسماں دُور ہے" کے ہی مصداق رہی، ایسے حالات میں اگر احسن مارہروی کو بھی حیدر آباد پہونچکر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو مجھے تو ذرا سا بھی تعجب نہیں۔

داغ کے ریاست حیدر آباد سے وابستہ ہونے کے بعد بیسوں مقامی و غیر مقامی شاگرد حیدر آباد میں ان سے لگے لپٹے رہے، داغ کی اس زمانہ کی زندگی اور حالات پر منصفانہ نظر ڈالی جائے تو حاضر باش شاگردوں میں بجز چند بے ریا افراد کے کوئی آپکو داغ کی عیاشی میں ممد و معاون ملے گا تو کوئی ان کی بٹیر بازی و تیتر بازی میں حصہ دار نظر آئے گا۔ کوئی پتنگ بازی میں شریک ہو کر ان کا دل بہلاتا تھا کوئی مگس تاب اغنیا کے مصداق، داغ کے دستر خوان پر شکم پُری کرتا نظر آتا تھا۔ یہ صرف مولانا احسن مارہروی ہی ایک ایسے شاگرد تھے جنھوں نے سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے حیدر آباد میں مستقل رہائش صرف اس لئے اختیار کی تھی کہ اُستاد کی خدمت کے ساتھ ساتھ علم و اَدب کی کچھ خدمت کر سکیں گے۔ وہ داغ کے لئے کسی طوائف کا نوٹو تحفتہً لے کر نہیں پہونچے تھے وہ داغ کے لئے ہرن کے لذیذ کبابوں کا بھی انتظام نہ کر سکے، ان کے پاس اپنے اُستاد کی پذیرائی کے لئے اگر کوئی چیز تھی تو وہ سچا خلوص تھا، سچی ارادت تھی، اور ایک ایسی حقیقی و مستحکم لگن تھی جو ۱۸۹۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۰ء تک اُن کے دل و دماغ میں جنوں کی حد تک قائم و دائم رہی، وہ جب تک حیدر آباد رہے اُستاد کی قلمی خدمت کرتے رہے اور جب حیدر آباد سے وطن مراجعت کی تو یہاں بھی ہر حال میں داغ کا ہی پروپگنڈہ کرتے رہے۔ لیکن آج ایک ایسی مخلص اور بے لوث ہستی کے لئے میرے محترم بھائی تمکین صاحب کاظمی نے یہ فرما کہ وہ حیدر آباد پہونچ کر داغ پر مسلط ہو گئے۔ حقائق کو نظر انداز فرما رہے ہیں اور ایک مخلص اور بے ریا شاگرد کو متہم فرما رہے ہیں، مولانا احسن مارہروی نے حضرت داغ کا نام کس کس طرح روشن کیا اور اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو داغ کے ساتھ جاں نثاری میں کیسے صرف کیا اس کی تفصیل آپ کو حسب موقع ملے گی۔ پُرانی باتیں اپنے موقع پر بیان ہوں گی یہاں آپ کل کی ایک بات ملاحظہ فرمائیے۔

۳۰ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائز نے کراچی میں مولانا احسن مارہروی مرحوم کی یاد میں "احسن ڈے" منایا تھا، یہ اجتماع دو نشستوں میں ہوا، پہلی نشست میں مقالات پڑھے گئے اور دوسری میں مشاعرہ ہوا، مقالات جو پڑھے گئے ان میں سے صرف ایک مقالے کا تھوڑا سا حصہ پیش کرتا ہوں، پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں۔

وہ اپنے اُستاد کے عاشق تھے، ایک دفعہ بشیر احمد ہاشمی نے جو اس زمانہ میں ٹریننگ کالج میں لکچرر تھے داغ پر ایک مضمون پڑھا، مضمون میں حکیبت کے نظریہ کی تائید کی گئی تھی کہ داغ کا طرز عیاشانہ تھا، مولانا کیسے خاموش رہتے، مضمون کے بعد بڑے مزے کی تقریر کی اور کہا "آج آپ جو چاہیں کہہ لیجئے مگر داغ کے کلام میں اُردو زبان کی لطافتیں اور نزاکتیں جس طرح جمع ہوگئی ہیں وہ اوروں کے یہاں مشکل سے ملیں گی۔

(ہماری زبان یکم اگست سنہ ۶۱ء)

جس موقع و محل کا ذکر سرور صاحب نے فرمایا ہے اس مقام پر داغ کے اور بھی قدردان موجود تھے لیکن بشیر احمد صاحب کی تقریر سے جس کے دل پر چوٹ آئی اور جو تڑپ اُٹھا وہ صرف مولانا احسن کی ذات تھی۔ اسی کا نام سچا خلوص ہے۔ اسی کو عشقِ حقیقی کا نام دیا جاتا ہے اور خلوص و ارادت کی اسی حقانیت کا نتیجہ ہے کہ ایک معمولی سی بات پروفیسر سرور کے ذہن میں مرتسم ہوگئی اور آج جس کا وہ ذکر کر رہے ہیں۔

بعض شاگردوں اور اعزاء داغ کی ریشہ دوانیوں کی بنا پر ایک موقع ایسا بھی پیدا ہوا کہ مولانا احسن صاحب مرحوم کی طرف سے داغ کو کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی، مولانا احسن نے خیال کیا کہ اُستاد اُن سے ناراض ہیں۔ لیکن داغ جیسا مردم شناس وقتی بیزاری اور کوفت کے باوجود اپنے مخلص شاگرد کو خوب سمجھتا تھا، اس حقیقت کے ثبوت میں داغ کا ایک خط ملاحظہ ہو:-

سید صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ!

تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ تمہارا ان شاگردوں میں شمار ہے جن کی سعادت بے لوث ہے، مگر ایک شکایت مجھے ہمیشہ تم سے رہی ہے اور وہ ابتک قائم ہے کہ تم میری بات پر کان نہیں دھرتے۔ تم نے اپنی عقیدت کو اندھا کر لیا ہے، طبیعت میں عجلت بہت زیادہ ہے، سوچنے سے پہلے رائے دے دینا تمہاری عادت ہے اور اس طرح اپنے کام بگاڑ لیتے ہو۔ تم اپنے دل سے یہ وہم دور کر دو کہ میں کسی کے کہنے سُننے سے تم سے ناراض ہوں۔ میں نہ درحقیقت تم سے ناراض تھا، نہ ناراض ہوں اور اب نہ کوئی وجہ ناراضگی ہے۔ (زبان داغ صفحہ ۸۷)

داغ کی ناراضگی کتنی اور کس قدر تھی اس کا اندازہ اوپر کی تحریر سے فرمائیے، درحقیقت مولانا احسن سے حضرت داغ فصیح اللغات کے سلسلہ میں ناخوش تھے، وجہ یہ تھی کہ مولانا اپنے گھر کی ضروریات کی بناء پر حیدرآباد سے چلے آئے تھے اور پھر باوجود ضرورت اور طلب و تقاضہ واپس نہ پہنچ سکے، لغت جو اپنی ابتدائی حالت میں تھا، نامکمل رہ گیا، لواحقین داغ نے انھیں غلط فہمی میں ڈالنا شروع کیا مولانا احسن کی مخالفت میں داغ کو کافی ورغلایا اور ان کے دل میں کدورت پیدا کرنے کی کوشش کی چنانچہ انھیں حالات سے متاثر ہو کر داغ نے دو ایک خط سرزنش انداز میں مولانا احسن کو لکھے میں نے یہ خطوط بجنسہٖ زبان داغ میں شایع کر دئے، لوگوں نے ان خطوط سے غلط قیاس آرائیاں شروع کر دیں۔ ان قیاس آرائیوں کی تکذیب کامل کے لئے تو زبانِ داغ ملاحظہ فرمائیے یہاں میں صرف حضرتِ داغ کا ایک خط پیش کرتا ہوں اس سے جہاں داغ کی ناراضگی کی اصل وجہ معلوم ہو جائے گی وہیں یہ بھی پتہ چلے گا کہ خاص فصیح اللغات کے معاملے میں داغ کی دلچسپیاں کتنی گہری اور مستحکم تھیں۔

"میں نے ضرور لکھا تھا کہ فصیح اللغات کا کام نہ تو خود کرتے ہو نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہو، اس سے مطلب یہ نہ تھا کہ تم بددل ہو کر کام ہی چھوڑ بیٹھو تمھاری تلوّن مزاجی سے جی کُڑھتا ہے، زبان پر مجبوراً ایسے الفاظ آتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام تمھارے سوا میرے شاگردوں میں دوسرا نہیں کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے آنے میں تساہل اور لغت کا کام رُک جانے سے مجھے بہت تکلیف پہونچی ہے اور شاید اس کا افسوس مرتے دم تک رہے، میرے لئے یہ مشکل نہیں کہ یہ کام میں یہاں دوسروں کے سپرد کر دوں، سراج الدین خاں کی رائے تھی کہ ایک ایک لفظ سب شاگردوں کو دے دیا جائے، مجھے یہ بھی ہرگز منظور نہ ہوا اگر کر سکتے ہو تو یہ کام تم ہی تمام کرو۔ یہاں آکر کرو تو سب سے بہتر، یہاں آئے بغیر کرتے رہو تو بھی مضائقہ نہیں، کسی کا دین صاف کر دینا سب خرچوں پر مقدم ہوتا ہے۔ تم نے حساب صاف کر دیا تمھارے حق میں ہی بہتر رہا، مجھے بھی ایک بڑی کوفت سے نجات مل گئی، اسی طرح اگر آدمی ذمہ داری محسوس کرتا رہے تو رونا کس بات کا، اور پریشانیاں کیسی، زیادہ بچوں کو پیار۔ ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء (زبان داغ صفحہ ")،

اس خط کے جواب مواجیہ میں تمام صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے اور برادرِ معظم جناب تسکین صاحب کاظمی کی تمام غلط فہمیاں دُور ہو جاتی ہیں۔

حیدر آباد کے قیام کے دوران مولانا احسن مارہروی نے جہاں فصیح اللغات اور جلوۂ داغ کی داغ بیل ڈالی تھی وہیں ایک چیز اھد تھی جس کی ترتیب میں وہ شریک حال رہے، مولانا کے حیدر آباد پہونچنے کے بعد مولوی افتخار عالم صاحب بھی حیدر آباد پہنچے

ل مولانا احسن مارہروی کے رشتہ میں چچا تھے یہ بھی کچھ مدت داغ کی خدمت میں حاضر رہے ان کی اہلیت و قابلیت کا بھی داغ نے اپنے اکثر خطوط میں اعتراف کیا ہے۔ مرحوم کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں حیات النذیر اپنی نوع کی پہلی جامع سوانح عمری ہے۔

موصوف نے داغ کی صحبت میں رہ کر ایک روزنامچہ کی بنیاد رکھی، دن بھر داغ کے ساتھ رہ کر وہ جو دیکھتے یا داغ سے سُنتے وہ نوٹ کرتے جاتے تھے، مولوی افتخار عالم صاحب کی واپسی وطن کے بعد وہ مسودہ احسن صاحب کے پاس رہا اور آخر قیام حیدر آباد تک حسب فرصت وہ بھی روزنامچہ کا تکملہ کرتے رہے، اسی مسودے کی مدد سے مولانا احسن صاحب نے اکثر مفید مضامین بعض رسائل میں شایع کروائے اور اب یہی روزنامچہ میں نے "بزم داغ" کے نام سے شایع کروادیا ہے۔

حیدر آباد سے واپسی:-

اواخر جون ۱۹۰۲ء میں مولانا احسن مارہروی حیدر آباد سے وطن چلے آئے، گو آئے چند روز کے لئے تھے لیکن وطن پہونچکر کچھ ایسے جھمیلوں میں پھنسے کہ پھر باوجود کوشش حیدر آباد واپس جانا ممکن نہ ہوسکا۔ اُن کے دادا جو نہ صرف بزرگ خاندان تھے بلکہ مولانا کی جائداد و املاک کے بھی نگراں و منتظم تھے کافی ضعیف ہوچکے تھے اور ضرورت تھی کہ مولانا ان کا ہاتھ بٹاتے لیکن شعر و شاعری اور خدمتِ ادب و زبان کا شوق مولانا کی گھٹی میں پڑا تھا اور اس کے سوا انھیں کوئی دوسری فکر نہ تھی وہ حیدر آباد سے واپس آنے کے بعد بھی اپنی جائداد اور گھر بار کی طرف سے خالی الذہن رہے، مولانا کے ان حالات سے اُن کے دادا مطمئن نہ تھے۔ وہ شعر و شاعری کو وقتی و ہنگامی مشغلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، انھوں نے مولانا کی گرفت کی نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے مارہرہ چھوڑدیا داغ وفات پاچکے تھے، مولانا نے لاہور کا رُخ کیا، ادبی ذوق ہمراہ تھا، لالہ سری رام اس زمانہ میں "خمخانۂ جاوید" کے نام سے ایک تذکرہ لکھوا رہے تھے مولانا کو قابل اور ہونہار دیکھ کر شریک کار بنالیا۔ چنانچہ خم خانہ کی پہلی جلد مولانا کی ہی ترتیب دی ہوئی ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا، مولانا نے لاہور سے ہی داغ کا آخری دیوان یادگار داغ شایع کروایا۔ دادا کی علالت کی اطلاع پاکر مولانا لاہور سے وطن واپس آئے اور دادا کی

وفات کے بعد مارہرے میں مستقل رہنے کے لئے مجبور ہونا پڑا، داغ کے سچے پرستار تھے اور اب شاعرانہ شوق کی پذیرائی کے لئے وطن میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں رہی تھی مولانا نے داغ اور داغ اسکول کو نمایاں کرنے کی باقاعدہ کوششیں شروع کردیں۔ فصیح الملک کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ جاری فرمایا، جو کلیتًا داغ کی شاعری، داغ کی زبان، داغ کے حالات اور داغ کے معنوی وابستگان کو نمایاں کرنے کے لئے مخصوص تھا، یہ رسالہ کئی سال تک جاری رہا اور بڑی آن بان سے شائع ہوتا رہا، اس رسالے کے اجرار سے مولانا احسن نے داغ کی شہرت ونام وری کا ڈنکا کردیا، لیکن اس کوشش و تگ ودو کے نتیجہ میں ان کی آبائی جائداد جو ابتک محض ان کے دادا مرحوم کی دیکھ بھال اور انتظام واہتمام کی وجہ سے محفوظ تھی، قرض کے بار سے ایسی ڈوبی کہ اس کا بیشتر حصہ ختم ہوگیا لیکن اس بربادی کے باوجود مولانا خوش تھے، مطمئن تھے اور انھیں کوئی پروا نہیں تھی، وہ بہت کچھ کھو چکنے کے باوجود اپنے اُستاد کے نام کو قائم رکھنے اور اسے روشن کرنے کی سعی میں آخر دم تک تازہ دم رہے۔ اُستاد کی یاد میں وہ مشاعرے بھی کرتے تھے اور دور دراز مشاعروں میں اپنے اُستاد کا مسلک لئے ہوئے بڑے ذوق وشوق سے شرکت بھی کیا کرتے تھے، اُن کے گھر پر صبح وشام جو اجتماع ہوتے ان میں وہ اُستاد کی شاعری کے ہر ہر نکتہ پر بحث کرتے اور اُستاد کی برتری ثابت کرتے، مولانا نے اسی رنگ اور ڈھنگ میں ایک مدت گزار دی، جائداد پر قرض ہوتا رہا بالآخر ۱۹۲۱ء میں مولانا سعدی کے اس شعر کے مصداق ہو گئے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق　　که یاراں فراموش کردند عشق

مگر خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ سچی لگن اور حقیقی جذبہ ہو تو حالات اچھے ہو ہی جاتے ہیں سنہ ۱۹۲۱ء میں ہی مولانا احسن مارہروی کو علی گڈھ یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی،

ملازمت اور مولانا احسن دو متضاد چیزیں تھیں، لیکن مجبوریاں سب کچھ کرا لیتی ہیں، وہ احسن مارہروی جن کے دوسرے پابند تھے وہ آج دوسروں کے پابند تھے، جن کا ساتھ وقت دیا کرتا تھا آج وہ وقت کا ساتھ دینے کے لئے مجبور تھے، ملازمت کی قید و بندش نے مدت تک انھیں پریشان و بے کیف رکھا مگر مجبوریاں حائل تھیں خوش و ناخوش انھیں ملازمت کی کڑیاں برداشت ہی کرنی پڑیں۔ اتفاق سے انھیں ملازمت بھی ایسی ملی جس میں علمی و ادبی دلچسپیوں کو قائم رکھنے کے اسباب فراہم تھے، کالج کے تعلیمی اوقات کے علاوہ ان کا کثیر وقت ادب و شعر کی خدمت میں گذارا کرتا تھا، وہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۸ء تک علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے اس زمانے کے حالاتِ زندگی ذرا تفصیل سے سنیئے:۔

مولانا احسن اور علی گڈھ:۔

مسلم یونیورسٹی سے مولانا کی، ۱۸ سال وابستگی بہ حیثیت اُستاد شعبۂ اُردو رہی، پہلے وہ انٹر کالج میں رہے بعد ازیں یونیورسٹی سے متعلق ہو گئے۔ وہ پُرانی تہذیب اور قدیم رہن سہن کے عادی تھے، انھوں نے ایسے ماحول میں تعلیم پائی تھی جہاں پہلا درس طلبار کو ادب و تہذیب اور حفظِ مراتب کا دیا جاتا تھا۔ علی گڈھ گو تہذیب و شائستگی کا حامل تھا لیکن روشن خیالی کی بنا پر علی گڈھ کی تہذیب و شائستگی تصنع اور آورد سے بھی پاک نہیں تھی، مولانا ایسے ماحول سے آئے تھے جہاں اُستاد کا ادب اس کی اہلیت و قابلیت اور فضل و کمال کے زیر اثر کیا جاتا تھا یہاں لڑکے اس کا سب سے زیادہ ادب کرتے جو شاندار ظواہر کا حامل ہوتا، خواہ اہلیت و قابلیت سے اُسے دُور کا بھی واسطہ نہ ہو، مولانا اس ذہنیت اور غیر دلچسپ ماحول سے مدت تک بیزار رہے، لیکن زندہ رہنے کے لئے بہر حال انھیں کچھ کرنا ہی تھا لہٰذا دل گرفتگی کے باوجود وہ زہر کے گھونٹ پیتے رہے اور حاجت و ضرورت کی بنا پر یہ ماحول انھیں گوارا ہی کرنا پڑا۔ یونیورسٹی کی

ملازمت میں علمی چمک تھی۔ لہذا مولانا نے اپنے اوقات کو کسی نہ کسی طرح کالج کی فضا میں بھی دلچسپ بنائے رہے، صدر شعبہ رشید صاحب صدیقی ان کے ہم مذاق تھے، حاذق صاحب اور چند دوسرے اساتذہ ادبی ذوق رکھتے تھے، یہ سب نہ صرف مولانا کے قدردان تھے بلکہ ان کی علمی و ادبی دلچسپیوں میں شریک رہا کرتے تھے، مولانا نے اپنے ذوق کی مناسبت سے علی گڈھ یونیورسٹی میں حدیقۃ الشعر کے نام سے ایک انجمن قائم کی، اس انجمن کا کام شعر و ادب کی گتھیاں سلجھانا اور سالانہ ادبی اجتماع کر کے طلبا میں ادب و شعر کا صحیح بالغ مذاق اور شوق پیدا کرنا تھا۔ مولانا جبتک علی گڈھ رہے یونیورسٹی میں سال بہ سال معرکۃ الآرا مشاعرے ہوتے رہے، ان مشاعروں نے نہ صرف ملک کے بعض غیر معروف و غیر مقبول شعرا سے لوگوں کو متعارف کرایا بلکہ مولانا کے ذاتی مذاق کی بنا پر ملک کے مشاہیر شعرا کے ساتھ ساتھ بعض گوشہ نشین قابل افراد بھی منظرِ عام پر آئے اور لوگ ان کے کمالاتِ فن سے متعارف و مستفید ہوئے۔ مشاعرے اور ادبی اجتماع تو ہندوستان کے بعض تعلیمی اداروں میں ہوتے ہی رہا کرتے تھے لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے جو مثالیں قائم کیں وہ بڑی اہم تھیں۔ اور یہ سب مولانا احسن مارہروی کی کاوشوں اور ذاتی مذاق کا نتیجہ تھیں، اس زمانہ کا ایک بھی مشاعرہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس میں ہندوستان کے تمام اعلیٰ سے اعلیٰ شاعر مجتمع ہو سکے ہوں۔ یہ صرف مسلم یونیورسٹی کو فخر حاصل ہے کہ سال کے سال وہاں ملک کے گوشے گوشے سے مشاہیر شعرا اور فاضل و باکمال شعرا مجتمع ہو جاتے تھے اور یہ سب مولانا کے تعلقات مولانا کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اسی نوع کے سالانہ مشاعروں میں وہ تمثیلی مشاعرہ ملک میں پہلی چیز تھا جو مولانا نے اپنی جدت طبع سے قائم کیا تھا۔ ریاست رامپور کے ایک یادگار مشاعرہ کی تمثیل مولانا نے پیش کی تھی، داغ

کے اہتمام سے رامپور میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس میں اس زمانے کے تمام بڑے بڑے شاعر شریک ہوئے تھے، مولانا نے ڈرامائی انداز میں یہ مشاعرہ اس طرح کیا کہ کسی لڑکے کو داغ کی شکل دی تو کسی کو امیر کی، کوئی جیتر شکوہ آبادی کی شکل میں نظر آیا تو کوئی کسی اور مشہور زمانہ شاعر کے بھیس میں بہر حال یہ یادگار مشاعرہ بہت پسند کیا گیا اور یونی ورسٹی کے ذہین طلباء نے ایک ڈرامہ کو بالکل حقیقت بنا دیا۔ انجمن حدیقۃ الشعراء اب بھی قائم ہے لیکن مُردہ بدست زندہ کے مصداق، مولانا کے بعد علی گڈھ کی شاعرانہ فضا سرد پڑ گئی، صرف اس زمانہ کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی ہے یا وہ چند لوگ باقی ہیں جو مولانا کی ان دلچسپیوں میں شریک کار تھے۔

مولانا احسن تھے تو صرف یونیورسٹی کے ایک اُستاد اور اس حیثیت سے اُن کو عام اُستادوں سے مختلف نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن اپنی افتادِ طبع کی بناء پر انھوں نے اپنے وجود کو آجکل کے عام اُستادوں سے مختلف اور ممتاز حیثیت دے رکھی تھی، کلاس میں انھیں صرف لیکچروں کی خانہ پُری سے کام نہیں تھا، بلکہ وہ وہاں بھی ایک فاضل اور محقق کی صورت میں جلوہ گر رہتے تھے، ایک ایک لفظ کی تحقیق، تصیحح اور ایجاد پر وہ بحث کرتے اور طلباء کے لئے سامانِ بصیرت مہیا کرتے، اگر کوئی لفظی و انشائی مسئلہ وضاحت طلب ہوتا تو اسناد کی تلاش او جستجو میں انتہائی غلو اور بڑی محنت کرتے، مختلف لغات دیکھتے، کوئی مضمون اپنا یا کسی دوسرے کا ذہن میں آجاتا تو کتابوں اور پُرانے رسالوں کو ٹٹولتے الغرض ایک ایک حوالے کے لئے اس قدر تلاش و جستجو کرتے کہ ان کے انہماک سے طالب علم گھبرا اُٹھتے مگر وہ ہر حال میں تازہ دم رہتے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جبتک وہ خود مطمئن نہ ہو لیتے اور طالب علموں کی تسکین نہ

کر دیتے، تعلیم کے مقررہ اوقات کے علاوہ شام کو صاحب ذوق طلباء ان کے گھر پہونچتے وہاں سن و سال اور مرتبے میں تفاوت کے باوجود مولانا کا طریق کار اور اندازِ ملاقات درس گاہ سے مختلف ہوتا، علمی مذاق کی باتیں کرتے، ادبی لطائف و نکتے بیان کرتے، اور ادبی تنقید و تبصرہ کے اصول و قاعدے بتاتے اور اس دوران میں علی القدر ضرورت پان اور چاء سے خاطر کرتے، گو درس گاہ اور قیام گاہ کے طور و طریق اور سلوک میں نمایاں فرق ہوتا مگر جہاں تک اس نوع کے اجتماع کی اصل روح کا تعلق ہے وہ یکسر استفادی ہوتی اور اس طرح کیا درس گاہ اور کیا مولانا کا گھر، ہر جگہ وہ ایک محقق، زبان داں اور فاضل کی حیثیت سے طلباء اور احباء کی توجہات کا مرکز بنے رہتے، وسیع النظری کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی لفظ پر بحث چھڑ جاتی تو بڑی برجستگی کے ساتھ اسنادی اشعار سناتے اور الفاظ کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرتے اگر طلباء کوئی اچھی بات بتاتے تو اس کو سراہتے اور معمولی حالات میں بھی ایسے انداز اختیار کرتے جس سے ان کی ہمت افزائی ہوتی، مولانا کے ایک نوجوان شاگرد رشید و سعید جناب غلام مصطفےٰ خاں صاحب اپنے ایک مضمون میں مولانا کے اس اُصول کو اس طرح واضح کرتے ہیں:-

> ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے لفظ "لیکن" کی اصلیت کسی طالب علم نے پوچھی، حضرت احسن نے ہم لوگوں کو مخاطب کیا، ہم لوگ خاموش ہوگئے۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے عرض کیا کہ یہ لفظ غالباً "لاکن" سے امالہ کرکے بنایا گیا ہے جس طرح قرآن شریف میں حضرت امام حفص رح کے نزدیک "مجراہا" میں امالہ کیا جاتا ہے، یہ سُن کر حضرت احسن بہت خوش ہوئے اور انھوں نے امالہ سمجھانا شروع کیا، پھر علم قرأت

کے مختلف اماموں کے مختلف املے اس وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے کہ اچھے سے اچھے قاری بھی بہ مشکل اس صحت کے ساتھ بیان کرسکیں گے
(علی گڈھ میگزین احسن نمبر صفحہ ۳۴)

آگے چل کر غلام مصطفےٰ صاحب پھر لکھتے ہیں:-

دقیق النظری کی مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں۔ یہ تو حضرت احسن کے متعلق کئی دفعہ معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے محض امتحان کے طور سے مختلف شعرار کے ہم وزن اور ہم قافیہ اشعار خلط ملط کر کے رکھدیے اور ان سے شاعر کا نام پوچھا، انھوں نے ہر شعر کو الگ الگ کر کے رکھ دیا اور کم از کم یہ ضرور بتایا کہ فلاں شعر فلاں عہد اور فلاں اسکول سے تعلق رکھتا ہے، گویا اُنھیں شعر کی نبض پہچاننے میں خاص مہارت تھی اور یہ سب ان کی پختہ کاری اور کہنہ مشقی کی وجہ سے تھا۔
(علی گڈھ میگزین احسن نمبر صفحہ ۳۵)

ایک دوسرے شاگرد محمد رضا علی خاں صاحب ایڈوکیٹ لکھتے ہیں:-

ادبی خدمت مولانا کی زندگی کا لازمہ بن چکی تھی اور یہی ان کی زندگی کا اول وآخر نصب العین تھا، زبان سے متعلق کیسا ہی جدید ترین مسئلہ، لسانی، تاریخی یا رسم الخط سے متعلق ہوتا اور یہ خیال ہوتا کہ ابھی انھوں نے کوئی رائے قائم نہ کی ہوگی، مگر مولانا فوراً اسی سلسلۂ کلام اس طرح شروع کر دیتے کہ گویا مدت ہوئی موصوف مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کر چکے ہیں، مسئلہ کے متعلق مستند معلومات اور جزئیات پر گہرا عبور، بے شمار تاریخی حوالے، مسئلہ کی ارتقائی کیفیت حال و مستقبل، غرض کوئی پہلو ایسا نہ ہوتا کہ وہ اُسے واضح نہ کرتے، تین تین چار چار (PERIODS) گزر جاتے نہ ہمیں وقت گذرتا معلوم ہوتا اور نہ مولانا کو تسکین ہوتی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عدیم المثال غواص اور پیراک ہے جو ہمیں سمندر کی تہہ میں پہنچا کر ہم

موتی نکلوا رہا ہے (احسن نمبر۔ صفحہ ۴۴)

کتابوں سے مولانا کو عشق تھا، ایک زبردست کتب خانہ کے مالک تھے، جس کے دو حصے تھے، ایک حصہ مارہرہ میں رہتا اور ایک علی گڈھ ہمراہ رکھتے، اس ذخیرے میں روز افزوں اضافہ بھی ہوتا رہتا تھا، اگر کسی علمی و ادبی مسئلہ کا حل اپنے یہاں کی کتابوں سے نہ ہوتا تو وہ یونیورسٹی لٹن لائبریری سے رجوع ہوتے اور جب اس لائبریری میں بھی انھیں سامان تسکین میسر نہ آتا تو بیرونی کتب خانوں سے تصدیق کرتے، انھیں یہ بڑی شکایت تھی کہ اتنی بڑی درس گاہ میں مشرقی علوم سے متعلق کافی ذخیرہ نہیں ہے، وہ چاہتے تھے کہ خواہ زر کثیر صرف کرنا پڑے لیکن یونیورسٹی کی حدود میں ایک گرانمایہ اور مفید مطلب کتاب خانہ ہونا ضروری ہے، ایک دفعہ گورکھپور گئے وہاں کے نامور رئیس مولوی سبحان اللہ خاں صاحب کے یہاں حسب معمول قیام فرمایا، مولوی صاحب نے زر کثیر صرف کر کے ہزاروں نایاب و بے بدل کتابیں جمع کر رکھی تھیں خود صاحب علم تھے ایک روز مولانا سے بولے کہ میں نے کافی رقم خرچ کر کے یہ مخطوطات اور کتب جمع کی ہیں لیکن ان کے مستقبل کی طرف سے متردد ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ ذخیرہ کچھ اس طرح محفوظ ہو جائے کہ علم و ادب کے جویا اس سے استفادہ اُٹھا سکیں، مولوی صاحب موصوف نے مختلف طریق کار سوچے اور ان پر مولانا احسن سے تبادلہ خیال کیا، کبھی چاہا کہ اُن کے نام سے گورکھپور میں ایک لائبریری کھول دی جائے اور کبھی یہ سوچا کہ ان کتابوں کو کسی بڑے کتاب خانہ میں ضم کر دیا جائے۔ اس خیال کے اظہار پر مولانا احسن نے فوراً یہ خیال ظاہر کیا کہ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری تعداد کتب کے اعتبار سے تو بہت وسیع ہے لیکن اقسام کتب کے اعتبار سے وہ تہی مایہ ہے۔ مشرقی علوم سے متعلق کتب اس لائبریری میں نہ ہونے کے برابر ہیں، مولوی سبحان اللہ خاں کا کتاب خانہ یکسر مشرقی علوم کی کتابوں پر حاوی ہے ایسے حالات میں اگر یہ کتاب خانہ مسلم یونیورسٹی

کو مل جائے تو ایک زبردست کمی پوری ہو جائے، مولانا نے اپنے اس خیال کا اظہار مولوی سبحان اللہ خاں صاحب سے کیا اور یہ انھیں کا کارنامہ ہے کہ اتنے زبردست اور قیمتی ذخیرۂ کتب کو وہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ۱۹۲۶ء میں گورکھپور سے وہ کتب خانہ منتقل ہو کر علی گڈھ آگیا اور آج لٹن لائبریری کی زینت بنا ہوا ہے۔[1]

مولانا احسن مارہروی مرحوم کی وفات پر مسلم یونیورسٹی نے علی گڈھ میگزین کا ایک خاص نمبر نکالا تھا، اس میں مولانا مرحوم پر بڑے اچھے اچھے مضمون شائع ہوئے تھے، اس احسن نمبر میں لوگوں نے عقیدت و مودت میں ڈوب کر بھی مضامین لکھے اور جذبات کی رَو میں بھی بہت کچھ لکھا، جذبات اور عقیدت کی رَو میں جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ حقیقت اور واقعہ ہونے کے باوجود بادی النظر میں تصنع معلوم ہوتا ہے، ویسے تو اس احسن نمبر میں کئی مضمون جذبات و عقیدت سے قطع نظر کر کے لکھے گئے ہیں لیکن پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا مضمون اپنی جامعیت اور اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہم ہے انھوں نے مزاحیہ انداز میں مولانا کی عادات، مولانا کے اطوار، مولانا کے علمی تباحر و ادراک پر بڑے معنی خیز انداز سے بحث کی ہے اور مولانا کی زبردست و ہمہ گیر شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے۔ میں نے گزشتہ اوراق پر مولانا کے محاسن کی تفصیل میں جو کچھ عرض کیا ہے ممکن ہے بعض افراد "خود میاں مٹھو" کے مصداق قرار دیں، اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ ایک خلف خواہ وہ کتنا ہی بے باک و آزاد ہو اپنے باپ کے اذکار جذبات سے غیر متاثر ہو کر نہیں لکھ سکتا، صاف گوئی اور حق پسند طبیعت رکھنے کے باوجود وہ مکلف رہتے اور حدِ ادب سے باہر قدم رکھنے کے باب میں مجبورِ محض ہے۔ ان حالات کے پیش نظر میں مولانا مرحوم کی سیرت

---

[1] مولانا مرحوم نے خود بھی ایک زبردست کتب خانہ چھوڑا تھا جو ان کی وفات کے بعد مسلم یونیورسٹی کو دے دیا گیا، وہ بھی لٹن لائبریری کی زینت ہے۔

کی وضاحت کے لئے پروفیسر رشید صاحب کا مضمون نقل کئے دیتا ہوں گو مولانا کے حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ مضمون بہت مختصر ہے لیکن لکھنے والے نے اس اجمال میں بھی تفصیل کی روح قائم رکھی ہے اس کے ملاحظہ کے بعد آپ مولانا کو کافی سمجھ لیں گے :۔

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہی گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں (میر)

مولانا سید علی احسن صاحب مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبۂ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا، اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو اُن سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر یا باہر ان کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ اُن کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا اُردو دان طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارے میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون وچرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے، زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ اور شاعری کی اُن لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو اُن کے پیش رؤں سے اُن تک پہنچی تھی۔ بایں ہمہ وہ اُردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار، اس نئے دبستان کے نقطۂ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے، خواہ شاعر کا مسلک ان کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا، اُردو میں مغربی انداز کی تنقید ان کے سامنے مروج و مقبول ہوئی، وہ خود اس کے پیرو نہ ہونے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامل نہ کرتے، اُردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا

یا کسی قسم کی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے، اپنے خیالات و تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے، دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے۔ اس اعتبار سے انکو "ترقی پذیر" اور "ترقی پسند" قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہیئے۔ ترقی پذیر اور ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سُنے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن ۶۶ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھرکم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور تواضع ملنسی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے جو بات نہیں معلوم ہوتی، اس کو دوسروں سے پوچھ لینے میں، خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا، مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، باتوں باتوں میں لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہو فوراً اس کی ڈھونڈ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں بار بار حوالوں کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے، مطلب برآری نہ ہوتی تو بلا کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہے بالآخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے، اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی کوئی علمی مسئلہ جو ان کو معلوم نہ ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و جستجو آجکل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر مرحوم کے ہی سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد جواب مرتب فرماتے سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے، کہتے تھے، اُستاد داغ مرحوم کے آخری

دور میں اُن کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث یا محل استعمال کے بارہ میں اُستاد سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ وہ اُن الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں، اُستاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے، اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبۂ اُردو میں آتے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قولِ فیصل قرار پایا۔

مرحوم کے پاس اُردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرتے، کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں، ایک دل کی اور دوسری کتاب کی، مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے، مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے، مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے، ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے ان میں اُن سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی اُن کو تاب نہ تھی، یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام، کہتے تھے کہ زبان کی غلطی کیسے سُن لوں، ساری عمر اسی میں گزاری، زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سُن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا، مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے۔ لیکن وہ اس بارے میں کہیں تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا

کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا اور نہ راز، اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں اتنی سمائی نہیں، اس سے میں نے بہت نقصان اُٹھائے لیکن کیا کروں، شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا۔

ایک بار ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی رازداں سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد مولانا میرے پاس آئے، عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے، میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بدنصیبی سے مولانا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب "سینۂ بسمل سے پرافشاں" نکلنا چاہتا تھا، میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں، مولانا سُنی اَن سُنی کرتے جاتے تھے اور جب اُنھیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمّت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھرکم جسم کو اس طرح تولا یا اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علٰحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تکان میں آکر پھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی کے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا، میں ان کے ارادے سے واقف ہو گیا۔ میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی ان سے اتنی ہی دور کر لی جتنی انھوں نے قریب کی تھی، مولانا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ انھوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہیں کیا اور نفسِ مضمون پر آنے کی جدوجہد شروع کر دی، میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ بیانہ ہوں گے چنانچہ میں نے روک تھام کے، بجائے راہِ فرار اختیار کی اور اُٹھ کر بھاگا، مولانا بہ آں جسدِ عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرمایا، رشید صاحب ارے وہ بھی سُنا: میں بھاگنے کی سائنس اور آرٹ یعنی REAR GRAND

ACTION جنگ پسپائی[51] سے پوری طرح واقف تھا، میں نے بھاگنے میں ہی جواب دیا۔ جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں، مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے، میں دروازے سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی، میں گر گیا، مولانا نے راز فاش کر دیا تھا[52]۔

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا، سید شاہ برکت اللہ سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے، اور اس خاندان کے بانی ہوئے چنانچہ مرحوم کی خاندانی عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے۔ علم و فضل کو اس گھر سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور رہا ہے، مرحوم کو خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے، وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب کہ مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور سے وابستہ رہتے تھے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے جب کوئی بچہ آتا مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولانا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا

---

۵۱ اس سلسلے میں غالب کا ایک شعر آپ کو یاد ہوگا ؎

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

۵۲۔ رشید صاحب نے مزاحیہ انداز میں مولانا کی فطرت کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے وہی لوگ پورا لطف اٹھا سکتے ہیں جو اصل واقعہ سے واقف ہیں۔

بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد بنایت لطف و شفقت سے اُن کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں، چھوٹے بڑے ہر بچے کا یہی وطیرہ تھا، سر پہ بال باریک ترشے ہوئے، پاؤں میں جوتا، سر پہ ٹوپی، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پہ طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع و اقسام کے نیکر اور قمیص پہننے کا جو عام رواج ہے، اور جسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے مولانا کے ہاں بچے ان سے بہت دور تھے بعض لوگ اس پر کہہ اُٹھیں گے کہ یہ "قل اعوذیت" تھی، قل اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں، لیکن نسوانیت یا شہدپن کے مقابلے میں قل اعوذیت کو گردن زدنی بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، لباس اور جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کیلئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں بھی نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسرے کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے پُرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ اُن کو ملزم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اُن پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی و نیا زمانہ مجموعۂ صد کرامات سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پُرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور ریاست کا ثمرہ تھی۔ انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعثِ برکت ہے۔

مرحوم پُرانی دُنیا کے آدمی تھے اور وہ ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور

چولیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دَور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے، مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہیں تھے، ہر جگہ ان کی پذیرائی خوش دلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دولت پرست اور کنبہ پرور تھے، ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح مدد کرتے تھے، اس سلسلے میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے اور تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی، تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں، عزیزوں، اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے، اس پر ہم سب ان پر فقرے بھی چست کرتے تھے، ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا کہ بھائی دیکھو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جب کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہلِ کرم دیکھتا ہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو۔[1] مرحوم شاعری کے قدیم دبستان کے پیرو تھے ساری عمر شعر و شاعری تصنیف و تالیف، تحقیق و تدقیق میں گزاری، اپنے اُستاد

---

[1] ۔ ۲۰ اور ۲۱ جولائی ۱۹۶۰ء کو کراچی میں "احسن ڈے" منایا گیا تھا، اس میں رشید صاحب صدیقی کا بھی ایک پیام پڑھا گیا تھا، اس پیام میں بھی وہ مولانا کی اس صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ملاحظہ ہو: "قرض لینے میں مطلق تامل نہ کرتے تھے جیسے قرض کو قرض نہیں آمدنی سمجھتے ہوں، قرض کا یہ عظیم تصور معمولی آدمی کے ذہن و ظرف میں نہیں آ سکتا!" رشید صاحب کے اس اجمال کی گویا اوپر تفصیل ہے۔

کے مسلم الثبوت پیرو تھے، لیکن کلام میں اُستاد جیسی اچھوتی، جیتی جاگتی شوخی رنگینی و جدت آفرینی نہیں تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا، لیکن فنِ شاعری میں مرحوم کا پایا نہایت اونچا تھا۔ زبان و محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کو سمجھنے، پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے، ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اُٹھتے جارہے ہیں، صحت و زبان و مصطلحاتِ شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کہیں برتنے پر کرے، شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے جارہے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں، فنی تبحر بڑی اہم چیز ہے، شاعری زبان و بیان ہی کے منتر دل میں جادو جگاتی ہے، اس لئے زبان و بیان کے مبقرہ معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے، شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا، کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیٰ حضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحۂ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا۔ عالم یہ تھا کہ شعبۂ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے، علمی بحثوں میں حصہ بھی لے رہے ہیں، ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جارہی ہے۔ مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہوگئی۔ مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اُس وقت ہوسکتا ہے جبکہ اصل مضامین جن سے یہ مثنوی[1] لفظاً و

---

[1] اس مثنوی کا نام "شاہکار عثمانی" ہے مطبوعہ و شائع ہوچکی ہے۔

معنًا وابستہ ہے پیش نظر ہوں۔ ایک دفعہ شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی، حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں جب مصرعۂ طرح دے دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولانا مرحوم یہ سُن کر آپے سے باہر ہو گئے۔ آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے تو ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا، ململ کی ڈھیلی آستین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے، فوراً اُٹھ بیٹھے، آستینیں چڑھالیں اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے، میاں ہوش میں آؤ، یہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں۔ اصغر صاحب کو تمھارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے، جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تابڑ توڑ جوتے اس وقت مصرعۂ طرح دو، پھر دیکھیں کون کتنے پانی میں ہے مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا، جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا، مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعر کے صدر ہیں، اگر مجوزہ آداب آئندہ سے مشاعروں میں نافذ کر دیے جائیں تو کیا ہو، مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے کہنے لگے بڑا اچھا ہو، کم بخت گویوں سے نجات ہو جائے

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "فصل" میں کس کس قسم کے وحوش وطیور کہاں کہاں سے کھنچ کر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے، یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرے میں مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صفِ اول میں سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں بچہ بانوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرعہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ ؎

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی، بھٹے بانسوں کے سیدھے سادے لب ولہجہ میں یہ رباعی پڑھی

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں ... بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن ... بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اُچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا، اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کا یہ شعر صفِ اول کو مدِ نظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرہ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی سہ

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت
یہ مصرفِ خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا، بڑے لطف و انہماک سے اسکا اہتمام کرتے تھے اور شعراء و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے یہاں کوئی تقریب منعقد ہے، مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی ہمل پہل کے گذر جاتے، ہر شاعر کا پورا پورا حفظ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص مسرور و مطمئن رہتا، اسی سلسلے میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعروں میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا۔ چنانچہ رخصت لے کر بمبئی گئے وہاں احباب و قدردانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا، توسیع رخصت کی درخواست کی اُس زمانے میں پرو وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا ایک عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دئے۔ ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم، انکے یہاں بیچ کا کوئی راستہ ہی نہ تھا، مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبۂ اُردو کی بھی خیر نہیں میری طلبی ہوئی مکالمہ سلئے

صاحب :۔ (سرخ ہوکر اور مع کرسی میری طرف رُخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں :۔ (متعجب و سراسیمہ ہوکر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے جناب؟

صاحب :۔ (چیں بہ جبیں ہو کر) بے شک۔ مولانا صاحب نے کیوں درخواست دی، اُن کو کیا حق تھا اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت کی۔

میں :۔ جناب والا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہو گی ورنہ بہ ظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہیئے۔

صاحب :۔ (نہایت غضبناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں کہ وہ آخر کیوں گئے۔؟

میں :۔ شعر پڑھنے۔

صاحب :۔ شعر۔

میں :۔ شعر، جناب والا۔

صاحب :۔ اپنے شعر۔

میں :۔ مولانا سے توقع تو یہی کی جاسکتی ہے۔

صاحب :۔ لیکن یہ ہوا کیا۔

مَیں :۔ ہوتا ہواتا کچھ نہیں عالی جاہا، لیکن مانتا کوئی نہیں۔

صاحب :۔ تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے۔

مَیں :۔ جناب والا میں اپنی نالائقی تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ کیا ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب اُن سے بھی گفتگو فرمائیں بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔

صاحب :۔ بہت خوب، مولانا صاحب کو میرے یہاں لانا (کسی قدر زہر خند فرما کر) مجھے اب تک ان سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

پروائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ صاحب یک لخت جھجکے[1] لیکن فوراً ہی سروقد ہوکر مولانا کو تعظیم دی انتہائی گرم جوشی کا اظہار کیا، مزاج پرسی فرمائی، پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پُرسان حال نہ تھا، البتہ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے، یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سروقد کھڑے ہوگئے، میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہوگئی۔

مرحوم سے کلاس میں اکثر لڑکے شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے، وہ بات اس زمانہ میں کہاں، ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت

---

[1] مولانا درحقیقت بہت وجیہہ اور بارعب انسان تھے، ان کی وجاہت اور دبدبہ کا ایک واقعہ مجھ سے سنیئے۔ ۱۹۳۳ء میں میں تحصیل کاسگنج میں تعینات تھا، وہاں کے تحصیلدار ایک سرکاری کام سے مارہرہ آئے، میں ہمراہ تھا، کام ختم کرکے بولے کہ چلو تمہارے والد سے بھی مل لیں، انگریزی حکومت میں سرکاری ملازمین جس رعونیت اور فرعونیت کے حامل ہوا کرتے تھے، ان خصائص سے یہ تحصیلدار بھی مالامال تھے، میں انھیں لے کر گھر پہونچا مولانا آرام فرمارہے تھے، میں نے تحصیلدار صاحب کو نشست گاہ میں بٹھاکر اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگادیا، تحصیلدار صاحب بڑی شان بے نیازی سے تشریف فرما تھے، والد مرحوم کے دو ایک ملاقاتی اور بھی آگئے ان کے درمیان تحصیلدار صاحب ایسے تشریف فرما تھے جیسے کوئی بڑی شخصیت معمولی لوگوں میں بیٹھی ہو، اسی عالم میں یکایک مولانا مرحوم اپنی آرام گاہ سے برآمد ہوئے اُن کے برآمد ہونے پر تحصیلدار صاحب کی جوں ہی ان پر نظر پڑی لوگوں نے دیکھا کہ وہ جھجک کر نہ صرف کھڑے ہوگئے بلکہ ان پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ کبھی ایک مونڈھے پر بیٹھے اور کبھی اُٹھ کر فوراً دوسرے مونڈھے پر بیٹھ جاتے تھے، والد مرحوم نے ہنس کر ان سے ہاتھ ملایا۔ اور باتیں شروع کیں تو ان کی دہشت کچھ کم ہوئی۔

آزردہ و برہم چلے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آگئے، معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے، مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے معاملہ رفت گذشت ہوا، کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی، فرمایا، رشید صاحب، طلبا پڑھنے نہیں آتے، وقت گذاری اور تفریح تفنن کے لئے آتے ہیں، یہ دنیا ہیں جو چاہے کرلیں علم تو ان کو آنے کا نہیں، میں نے عرض کیا، مولانا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجئے گا، یہ طلبار کا قصور نہیں ہے، دنیا کا یہی رنگ ہے، جو باتیں ہمارے آپ کے زمانے میں قدر و قیمت رکھتی تھیں وہ اب ختم ہو چکی ہیں، حفظ مراتب اُٹھ چکا ہے یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں مطالبات نفس کا ہے، کڑھیے نہیں، لڑکوں کو معاف کر دیجئے ان کو معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کا شکار ہیں مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا، بولے جی نہیں، میں نالائقوں سے کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا، مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا، مولانا فرض کیجئے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں، آپ شوق سے دوسرا کلاس لے لیجئے۔ لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کرتے ہیں، مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انا للہ[1] پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چاء سے عشق تھا، بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا، نصف پیالی شکر اور نصف چائے، اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے، برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے تھے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار، کم کرنا

---

[1] ۔ رشید صاحب نے مرحوم کی کتنی سچی اور ہو بہو تصویر کھینچی ہے، اس سے وہی لطف رہے ہوں گے جن کا مرحوم کے اس انداز گفتگو سے سابقہ پڑا ہوگا۔

بھی گوارا نہ کرتے تھے، ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پروا نہ کرتے تھے، اس وضعداری نے کاربنکل سے دوچار کیا اور کاربنکل نے انھیں اُن کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعادِ عمر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن اس سِن و سال کے باوجود اتنا کام کر لیا کرتے تھے جو اُن سے بہت کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا، اُن کے قوائے ذہنی و جسمانی پورے طور پر اُستوار و بیدار تھے۔ شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا، رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ، کیسے کیسے زمانے کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۲۰ر اگست ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوشِ رحمت میں پہونچ گئی۔

اگست ۱۹۴۰ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا، مکان سے یونیورسٹی آ رہا تھا کہ خبر ملی مولانا احسن کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں: مولانا کی اقامت گاہ پہونچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا، مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے اور کیوں حضور سنتا ہوں کہ "خنداں" شایع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ کہاں مرضِ الموت کا یہ کرب، کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب، اللہ اکبر، میں مبہوت ہو گیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہو گئی ہے، میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا، لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے کہ رشید صاحب خدارا کتاب بھیج دیجئے، میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے

کتنے ہیں! عجیب اتفاق کہ کتاب میں نہ بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

(ماخوذ از علی گڈھ میگزین احسن نمبر۔ بہ تمام وکمال)

مولانا کا کیرکٹر اور مولانا کے حالات پر اس سے زیادہ جامع ومانع تحریر دوسری نہیں ہوسکتی، رشید صاحب نے کہیں تفصیل سے، کہیں اشاروں اور کنایوں میں اور کہیں مزاحیہ انداز میں سب کچھ کہہ دیا ہے اس سے زیادہ اس مختصر کتاب میں گنجائش بھی نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد:۔

مولانا نے ۲۰ سال مسلم یونیورسٹی میں ملازمت کی ۱۹۳۸ء میں وہ ریٹائر ہوگئے، یہ ایک عجیب اتفاق ہے مولانا احسن جو شروع ملازمت میں اس قید و بند سے سخت نالاں و پریشاں تھے وہی جب ۲۰ سال کی قید اوقات کے بعد مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے لگے تو انھیں افسوس تھا۔ دو ایک سال کی میعاد میں توسیع بھی ہوئی لیکن یہ کب تک بہر حال مرحوم کو یونیورسٹی کی خدمات سے ٹھیک دوش ہی ہونا پڑا، ملازمت کی ٹھیک دوشی سے کچھ پہلے مرحوم نے ایک خط مولوی غلام مصطفےٰ خاں صاحب کو لکھا تھا اس میں رقم طراز ہیں:

میرا معاملہ توسیع ہنوز طے نہیں ہوا، نئے وائس چانسلر ابھی ادھر میں ہیں، تا بہ دیگراں چہ رسد، دیکھیے کس کل اونٹ بیٹھتا ہے (۲۰ ۴/۲)

نئے وائس چانسلر سر سلیمان کا معاملہ طے ہوا اور ان کے ساتھ ہی مولانا مرحوم کا معاملہ توسیع بھی طے ہوگیا۔ ۱۲ اگست ۳۸ء کو سید ظہیر حیدر صاحب جگراؤں ضلع لدھیانہ کو لکھتے ہیں:۔

اسال پیرانہ سالی کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہوگیا ہوں اس لئے آئندہ خط و کتابت ہو تو عنوان کے پتہ پر خط لکھا جائے۔

مولانا مرحوم کی یونیورسٹی سے جدائی نہ صرف انھیں شاق گذری بلکہ بعض احباب اور تلامذہ نے بھی اسے محسوس کیا، بعض لوگوں نے اس سلسلے میں مولانا کو اظہار افسوس میں خطوط لکھے۔ مولانا نے فرداً فرداً سب کو ایک انداز سے جوابات دیے جن کے ملاحظہ سے اُن کی نہ صرف اُس وقت کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ آئندہ عزائم پر بھی روشنی پڑتی ہے، ایسے بعض خطوط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

"اگر شاہ سلیمان جیسا پابند قانون وائس چانسلر نہ آتا تو غالباً دم آخر وہاں سے نہ ہٹتا۔"

مولانا کے اس اظہار خیال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی مدتِ عمر کا پتہ تھا، اس لئے کہ اس اظہار خیال کے دو ڈیڑھ سال بعد ہی مولانا کا انتقال ہوگیا، اور دو ایک سال کی مدتِ ملازمت میں توسیع کچھ مشکل نہ تھی۔ مولوی غلام مصطفےٰ صاحب نے اپنے ایک خط میں اظہار تاسف کیا تو انھیں لکھتے ہیں :-

"مسلم یونیورسٹی سے علیحدگی یا دنیا سے جدائی بہرحال ایک دن ہوتی اور ہوگی اس لئے اس کا ملال عبث اور اس کا خیال فضول ہے، اب یہ دعا کیجئے کہ باقی انفاس خدمتِ خلق میں صرف ہوں اور بقیہ زندگی پر کوئی حرف نہ آنے۔"

احباب و تلامذہ نے مولانا مرحوم کے ریٹائر ہونے پر پارٹی دی، مولانا نے اس موقع پر "رخصتی منبر" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی، پوری نظم مرحوم کے جذبات و تصورات کا آئینہ ہے، نظم بہت لمبی ہے صرف آخری چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

اردو کا ڈپارٹمنٹ یکسر — میری خدمات کا تھا محور
صدرا سکے ہیں نیک پاک سیرت — صدیقی[۱] وحاذق المودت

۱۔ رشید احمد صاحب صدیقی۔

اور اس کے سوا جو لیکچرر ہیں — ایک ان میں سرور[1] خوش سیر ہیں
حاذق[2] کا فراق ہے شاق — کہتا ہے یہ اُن سے اُن کا مشتاق
حاذق رخصت، ظہیر[3] رخصت — آخر میں میاں مشیر[4] رخصت

مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد مولانا اپنے وطن یعنی مارہرہ میں مستقل قیام فرما ہو گئے، اب مرحوم کے پاس کافی وقت تھا، ادب و شعر کی خدمت جب ملازمت کی قید و بند میں جاری رہی تو اب وہ مکمل آزاد تھے، انھوں نے بڑے بڑے پروگرام بنائے، ان پر عمل کرنے کا بھی ارادہ تھا اور دوسرے ارادوں پر غور و خوص ہی ہوتا رہا لیکن ایک لگن ان کی ایسی تھی جو شروع عمر سے مسلسل جاری تھی اس کے لئے نہ کسی ارادے کی ضرورت تھی اور نہ کسی پروگرام کی، اس لگن کے تو مولانا ایسے گرویدہ تھے کہ یہ اُن کی عادتِ ثانیہ ہو کر رہ گئی تھی، یہ لگن اپنے اُستاد حضرت داغ کی خدمت تھی۔ جبتک یونیورسٹی کی قیود میں رہے قولاً و فعلاً وہ اُستاد داغ کا پروپیگنڈہ کرتے رہے، مختلف رسالوں میں داغ پر مضامین لکھنا تو گویا ایک ضمنی چیز تھی، کہیں اور کسی موقع پر وہ اُستاد کی نمائندگی کرنے سے باز نہ آتے تھے، یونیورسٹی میں حدیقۃ الشعر کے صدر تھے، ہر سال اس انجمن کے اہتمام سے مشاعرے کرتے مشاعروں کے قدیم طریقے اور روش کو ترقی یافتہ شکل دینے کا ارادہ ہوا تو ایک نئی چیز دماغ میں آئی اور اس نئے تخیل میں بھی اُستاد داغ کو نمایاں اور اُجاگر کرنے کا خیال قائم و دائم رہا۔ انھوں نے ایک تمثیلی مشاعرہ کیا۔ رام پور کے ایک ایسے مشاعرے کی تصویر کشی کی جو کسی زمانے میں داغ مرحوم کے اہتمام سے ہوا تھا اور اس میں نہ صرف جناب داغ نمایاں تھے بلکہ حضرت امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی وغیرہ بہت سے کاملین فن شریک تھے، مولانا نے لڑکوں کو ان مشاہیر شعراء کا روپ بھروا کر ایک ایسا مکمل تمثیلی

---

[1]۔ آل احمد سرور لیکچرر [2] محمد حاذق صاحب استاد فارسی [3] ظہیر الدین صاحب علوی لیکچرر [4] مشیر اردو ڈپارٹمنٹ کا نگراں ملازم۔

مشاعرہ کروایا کہ۔ کافی پسند کیا گیا اور اس طریقے کے مشاعرے اور جگہ بھی ہونے لگے یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد مولانا کے کیا عزائم تھے ان کا اظہار خود انھوں نے اپنے ایک خط میں یوں فرمایا تھا، اپنے ایک دوست خواجہ تاش کو لکھتے ہیں:-

سال گذشتہ میں اُستاد کے کلام کا انتخاب کیا جس کے دو حصے مرتب ہوئے ایک ایسا کلام جس میں فارسی لطف نہ اضافت نہیں، دوسرا مخلوط منتخب داغ کا الہ آباد کے جعفری برادرس نے حقِ تالیف لے لیا ہے برس دن ہو چکا ابتک وہ شائع نہ کر سکے۔ اب اُستاد مرحوم کے خطوط مرتب کر رہا ہوں، "تاریخی نام انشائے داغ رکھا، مگر باوجود سعی ۱۳۵۸ھ میں شائع نہ ہو سکا جسکی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ کچھ خطوط ملنے والے تھے ان کے ملنے میں توقف ہوا۔ وہ خطوط نواب رام پور کے نام تھے اب وہ مل گئے ہیں اور اسکی ترتیب جاری ہے، امراض، عمر، مزاج، حالات ایسے ہیں کہ مستقل جم کر کام نہیں کرنے دیتے، میں بھی چھیاسٹواں سال ختم کر رہا ہوں، جسمانی ساخت تو خواہ مخواہ مرد آدمی بنائے ہوئے ہے لیکن اوجاع مفاصل نے بہت پریشان کر رکھا ہے، اس وقت یہ خط اس عالم میں لکھ رہا ہوں کہ اُلٹے بازو اور سیدھے پاؤں میں درد ہے اور ایسا درد ہے کہ ایک کروٹ دو منٹ نہیں بیٹھا جاتا بایں ہمہ جو کچھ ہو سکتا ہے کئے جاتا ہوں، دعا کا طالب ہوں کہ حیاتِ مستعار اتنی مل جائے کہ اُستاد مرحوم کی لاالف اور تمام کر دوں پھر والسلام خیر ختام۔ (۲۵ جون ۱۹۴۰ء)

آپ نے دیکھے مولانا مرحوم کے عزائم اور ان کی لگن، یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا احسن

مارہروی مرحوم اپنے اُستاد جناب داغ کے سچے پرستار اور شیدا تھے، اگست ۱۹۴۰ء

کے شروع ہفتہ میں وہ مرض کاربنکل کا شکار ہوئے، پندرہ بیس دن مارہرہ، اور علی گڈھ میں علاج و معالجہ ہوا اس کے بعد پٹنہ تشریف لے گئے اور وہاں ۳۰ر اگست سنہ ۴۰ئہ کو وفات پائی، دوسرے روز آپ کا جسدِ خاکی مارہرہ پہونچا اور شب کو ۹-دس بجے اپنی آخری آرام گاہ پہونچا دیا گیا، کچھ روز بعد جب ہم لوگ ہوش وحواس میں ہوئے تو مرحوم کے اس سامان کا جائزہ لیا جو پٹنہ کے سفر میں ساتھ تھا یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مرض کاربنکل کی تکلیف اور اذیت کے دوران میں بھی مولانا خدمتِ اُستاد کے تصور سے تہی مایہ نہیں رہے، آپ کے سامان سے "انشائے داغ" کا مسودہ برآمد ہوا اور تین داغ کے ایسے خط برآمد ہوئے جو مرحوم نے پٹنہ میں اپنے ایک دوست خواجہ تاش سے حاصل کئے تھے، اللہ اکبر، مولانا مرحوم کو آخری سانسوں تک داغ کی یاد آتی رہی اور مرض کی ناقابل برداشت کراہ آہ میں بھی خدمتِ اُستاد کا تصوّر ان کے دماغ سے دور نہ ہوا، داغ پر مولانا کی دو کتابیں یعنی منتخب داغ اور انشاء داغ مرحوم کی وفات کے بعد شائع اور مطبوع ہوئیں افسوس داغ کی لائف وہ مرتب نہ کر سکے اور وہ کمی جو "جلوۂ داغ" کی اشاعت کے بعد سے برابر محسوس کی جاتی رہی وہ مولانا مرحوم کے ہاتھوں سے پوری نہ ہو سکی[1]۔

مولانا احسن مرحوم کی اولادِ صلبی:-

دو بیویوں سے مولانا مرحوم کے ۵ لڑکے اور ایک لڑکی موجود ہیں، ان میں ۳ لڑکے پاکستان اور دو لڑکے لڑکی بھارت میں ہیں۔ بڑے صاحبزادے سید محمد احسن صاحب خاندان کے پہلے گریجویٹ ہیں۔ موصوف سے پہلے خاندان میں علوم مشرقی کے فضلاء و کملاء تو ضرور گزرے لیکن مغربی تعلیم سے کوئی بہرہ ور نہ تھا، مولانا کے اس رجحان نے

---

[1] مولانا مرحوم کی اس آرزو کے پیش نظر راقم الحروف نے نواب مرزا خاں داغ کی ایک مفصل اور مشرح سوانحِ عمری تصویرِ داغ کے نام سے ترتیب دے کر پریس کے حوالے کر دی ہے ممکن ہے اس سے یہ کمی دور ہو جائے۔

خاندان کے دوسرے افراد کو بھی انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا، لیکن خاندان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مولانا کی اولاد کو ہی امتیاز حاصل رہا، پانچ لڑکوں میں ایک گریجویٹ ایک ایم اے اور ایک ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کچھ کم امتیاز نہیں ہے۔ سید محمد احسن صاحب مُسلم یونیورسٹی میں بطور پرسنل اسسٹنٹ پرو وائس چانسلر اور بعد ازیں اسسٹنٹ رجسٹرار کی حیثیت سے ملازم رہے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد علی گڈھ میں ہی مقیم ہیں۔ منجھلے صاحبزادے سید ابن احسن مارہروی کے نام سے دنیائے شاعری میں مشہور ہیں، آپ حافظ ہیں، ریلوے میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد دادو صوبہ سندھ پاکستان میں قیام فرما ہیں، بعض خصائص کے اعتبار سے آپ اپنے والد کی تصویر ہیں، شاعری کا شوق ہے اور موصوف کے اس ذوق سے خاندانی سنت قائم ہے، تیسرے صاحبزادے ڈاکٹر انعام احسن ہیں جن کی تعلیم کا تکملہ ہندوستان اور انگلینڈ میں ہوا، بھارت کی تقسیم کے وقت وہ انگلینڈ میں تھے، وہاں سے واپس ہو کر پاکستان میں سکونت اختیار کی، آزادہ روی و آزادہ خیالی بچپن سے فطرت میں تھی لہذا ملازمت کی قید و بند پسند نہ ہوئی، پرائیوٹ کاروبار شروع کیا اور آج کراچی میں آنکھ کے ماہر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں، چھوٹے صاحبزادے سید احسن بھی پاکستان گورنمنٹ میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں، پانچواں بدنصیب خلف اس کتاب کا مولف یعنی راقم الحروف ہے، جس میں کسی پہلو کوئی خوبی نہیں، بجز اس کے کہ مولانا احسن مرحوم کی اولاد میں شمار ہے۔ بھارت سرکار کا باشندہ ہے بھارت سرکار کے خزانے سے آذوقہ پاتا ہے اور کلکٹری بدایوں میں ایک کلرک کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کی صاحبزادی کا عقد خاندان میں ہی ہوا، شوہر کا نام سید الطاف احمد ہے جو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں کلرک ہیں۔

مولانا مرحوم اپنے آفتاب کے سلسلے میں بڑے خوش قسمت کہے جاتے تھے، وہ خود

اکثر جب کبھی خاندانی و آبائی جائداد کی بربادی کا ذکر آجاتا تو فرمایا کرتے تھے کہ گو میں اپنی اولاد کے لئے آبائی جائداد بطور ترکہ نہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن مطمئن ہوں کہ ان سب کو اس قابل چھوڑ رہا ہوں کہ وہ آبائی جائداد پر تکیہ کرنے کے بجائے خود اپنے دست و بازو سے آذوقۂ حیات حاصل کر سکیں گے۔ ان کو میں نکما اور ناکارہ نہیں چھوڑ رہا ہوں کہ انھیں اپنی معاش کے لئے خاندانی خرقہ و سجادہ کی آڑ یا سہارہ لینا پڑے، وہ خود اس علت سے دور رہے۔ تمام خصوصیات اور کامل ترین اہلیت و قابلیت کے باوجود مولانا مرحوم نے "پیری مُریدی" کو ہمیشہ بے ضرورت اور بے کار متصور کیا، اُن کی وفات کے بعد جیسا کہ اس خاندان میں رواج ہے بعض سر پھرے افرادِ خاندان نے برادرِ معظم و محترم جناب سید محمد احسن صاحب کو خلفِ اکبر کی حیثیت سے والد مرحوم کی جگہ صاحبِ سجادہ قرار دینے کے سلسلے میں رسوم ادا کرنے کی طرف متوجہ کیا، آپ اولاً تو ادھر متوجہ نہ ہوئے لیکن لوگوں کے اصرار نے جب آپ کو بے بس کر دیا تو خاندانی رسوم ادا ہوئیں۔ سب نے دیکھا کہ آپ نے خاندانی خرقہ بھی پہنا اور سجادہ پر بھی متمکن ہوئے لیکن ان وقتی و رسمی باتوں کے بعد جہاں تک عمل کا سوال تھا آپ اپنے والدِ مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر اُس دنیائے مکر و فریب سے دور ہی رہے جس میں انسان کو اپنے ظاہر سے بطون کو بالکل مختلف و متغائر رکھنا پڑتا ہے۔

مولانا کی اولادِ معنوی :-

مولانا مرحوم کی معنوی اولاد کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جو بہ سلسلہ شعر و شاعری مولانا کے شاگردوں میں شمار ہیں دوسرے وہ جنھوں نے مسلم یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت سے مولانا سے فیض اُٹھایا، ایسے شاگردوں کی تعداد ناقابل شمار خیال کی جا سکتی ہے، اس کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ مجھے اپنی ملازمت

کے سلسلے میں اکثر اعلیٰ و ادنیٰ افسران اور ملازمان سرکاری سے واسطہ رہا ہے ہندستان کی تقسیم سے پہلے مجھے زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ملی جو "علیگ" تھے اور انھیں کسی نہ کسی زمانہ میں مولانا مرحوم کی شاگردی کا موقع مل چکا تھا، پاکستان کی تخلیق کے بعد ایسے لوگ بھارت میں خال خال رہ گئے ہیں بہر حال ان کی مجموعی تعداد کا اگر مفصلاً جائزہ لیا جائے تو مولانا مرحوم کے ایسے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست مرتب ہو جائے گی لہذا ان سے قطع نظر کرکے میں ان تلامذہ کا ذکر کرتا ہوں جنھوں نے شعر و ادب میں مولانا مرحوم سے فائدہ اُٹھایا، ایسے تلامذہ کی تعداد بھی کافی ہے، اس وقت جن کے نام ذہن میں آرہے ہیں ان میں آبر احسنی، قنبر احسنی، غلام مصطفےٰ صاحب، رازؔ احسنی، مستؔ احسنی، جامیؔ بدایونی، نوشاہ مارہروی، شادؔ بدایونی، مداحؔ یا احمق پھپھوندوی، محفوظ سورولی، شارق میرٹھی، قیس مینڈو، اخضر اکبرآبادی، اختر بریلوی، جذب احسنی، اشہر احسنی۔ عالی بدایونی، محق بدایونی، نازک احسنی، انجم بدایونی وغیرہ ایسے شاگرد ہیں جن کی سعادت و عقیدت کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، ان لوگوں نے اُستاد کی وفات کے بعد اُستاد کی یاد کو دل سے محو نہیں کیا اور کسی نہ کسی نوع سے حق شاگردی ادا کرنے میں ثابت قدم رہے، ان میں دو ایک صاحب تو ایسے ہیں جو از سر تا پا خلوص کا مجسمہ ہیں، ان کی عقیدت میں کہیں جھول نہیں۔ کہیں تکلف و آورد کا نام نہیں، ان کو کسی طرح ٹٹولیے، جھنجوڑیے، آزمایش کی کسوٹی پر کسیے ہمیشہ انھیں کیا قال اور کیا حال ہر اعتبار سے اُستاد کا سچا پرستار اور عاشق پائیں گے۔ مفصلۂ بالا شاگردوں میں آبر صاحب، احسنی و لنوری کو بہت ہی قریب سے مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ عجیب دل و دماغ پایا ہے۔ فنافی الاستاد ہیں، خلوص و عقیدت کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے اگر کبھی کوئی قدم غلط بھی پڑا تو وہ

بھی محض اُستاد کی محبت و گرویدگی میں اندھا دھند پڑا۔ مولانا احسن مرحوم کے سب سے کامیاب شاگرد ہیں۔ فنِ شعر کے اعتبار سے بھارت کے اُردو شعرا میں ان کا صفِ اوّل کے شاعروں میں شمار ہے، لیکن افسوس آبر صاحب مردم شناس نہیں ہیں انہوں کو پہچاننے میں اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا شاگردوں میں سے بعض شاگردوں کے رشحاتِ قلم اور مضامین دیکھنے کا اتفاق ہوا، ان میں غلام مصطفےٰ صاحب کی ہر تحریر مجھے خلوص و ادب اور قدر دانیٔ اُستاد سے بھرپور ملی۔ یہ مولانا مرحوم کے ایک ایسے شاگرد ہیں جن کی قدر مولانا صرف ان کے خلوص اور ان کی عقیدت کی بنا پر ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی ہونہاری اور ان کی علمی سوجھ بوجھ اور فنی اہلیت و قابلیت نے بھی مولانا کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

جس طرح کسی گروہ یا قبیلے میں چھوٹے اور بڑے، اچھے اور بُرے ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اسی طرح مولانا مرحوم کی معنوی اولاد میں دو ایک ایسے شاگرد ملتے ہیں جن کی عقیدت مشکوک، ڈانواں ڈول اور ان کے حالات ہمیشہ ناقابلِ اطمینان رہے، ایسے لوگوں میں ایک ذات جناب صدیق حسن صاحب مارہروی کی ہے، یہ مولانا مرحوم کے مقامی شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ مرحوم نے ان پر بڑا ریاض فرمایا تھا اچھا کہنے لگے تھے، لیکن مارہرے کے حضرات کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوئے، اچھے اور بھلے خاندان کے فرد ہونے کے باوجود مارہرہ کی مذموم اور نیچی سوسائٹی میں رات دن بسر اوقات کرنے لگے اور اخلاقی حیثیت سے گر گئے، مولانا مرحوم نے "عاق" کر دیا، ایک مدت تک مولانا اُن سے بے تعلق و بے واسطہ رہے، آخر زمانہ میں صدیق صاحب نے مولانا مرحوم کو راضی کر لیا۔ سادہ لوح اور بلند اخلاق اُستاد نے تمام قصور معاف کر دیئے اور صدیق صاحب کو "بزمِ احسن" میں پھر جگہ مل گئی۔ لیکن وہ جو مثل ہے

نیشِ عقرب از پئے کیں است   کہ مقتضائے طبیعتش ایں است

مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد صدیق صاحب نے اپنے فطری و جبلی تقاضے سے مجبور ہو کر پھر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، اس سے زیادہ بیہودگی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اُستاد مرحوم کی وفات کے بعد اُن کے فاتحہ چہلم میں جب اکثر مولانا کے تلامذہ اور احباب جمع ہوئے تو صدیق صاحب نے مولانا مرحوم کی "جانشینی" کا فتنہ کھڑا کر دیا، بعض سادہ لوح اور مخلص تلامذہ میں یہ پروپیگنڈا فرمایا کہ شاعری میں مولانا مرحوم کا ایک "جانشین" ہونا چاہیئے، اور منجملہ تلامذہ احسن کسی ایک کا انتخاب ہو جانا چاہیئے تاکہ اس موقع پر اس کا عام اعلان بھی کیا جاسکے۔ یہ آگ لگا کر صدیق صاحب تو الگ ہو گئے۔ دوسرے تلامذہ نے یہ سوال برادر معظم سید محمد احسن صاحب کے سامنے رکھا، موصوف چونکہ طبعاً شعر و شاعری سے مناسبت نہیں رکھتے علاوہ ازیں انتہائی سادہ لوح اور خوش باطن ہیں آپ نے تلامذہ کے اس خیال پر صاد کر دیا، دوسرے بھائیوں سے بھی استفسارات کئے گئے۔ انھوں نے بھی اس تحریک اور اس سوال کی روح کو نہ پہچانا اور کوئی اعتراض نہ کیا، آخر میں راقم الحروف سے بھی مشورہ طلب ہوا۔ میں نے بہ یک لمحہ اس روح تک رسائی پالی جو اس تحریک میں جلوہ گر تھی اور صاف صاف عرض کر دیا کہ "جانشینی" کی فکر تو اس شاعر کے بعد کی جاتی ہے جو لاولد ہو یا اس کے اعقاب میں کوئی اسکی جانشینی کا اہل نہ ہو، داغ مرحوم لاولد تھے لہٰذا اُن کے بعد اُن کے شاگردوں نے جانشینی کا سوال اُٹھایا حالانکہ وہ بھی غلط تھا جب کہ داغ کے اعقاب میں سائل دہلوی جانشینی کے لائق و سزاوار تھے، مولانا احسن مارہروی کا جانشین انکے تلامذہ میں تلاش کرنا تو کسی صورت معقول و مناسب نہیں جبکہ مولانا مرحوم صاحب اولاد تھے اور انھوں نے ہر اعتبار اور ہر نوعیت سے اپنے اولاد میں اپنے

"جانشین" چھوڑے ہیں، خاندان خرقہ و سجادہ سے گو وہ ہمیشہ دور رہے لیکن اس لحاظ سے بھی برادر معظم جناب سید محمد احسن صاحب ان کے حقیقی اور نہایت موزوں جانشین ہیں، رہا سوال شاعری کا تو بفضلہ تعالیٰ ان کے منجھلے صاحبزادے حافظ سید سعید احسن صاحب شعر و شاعری سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں بھی مولانا مرحوم کے جانشین کی تلاش اُن سے قطع نظر کر کے شاگردوں میں کی جانا حماقت ہی نہیں بلکہ حق تلفی ہے، میرے اس جواب پر جمیع تلامذہ خاموش ہو گئے اور صدیق صاحب کی لگائی ہوئی آگ میری ایک پھونک سے ختم ہو گئی اور ایک بڑے ہنگامہ اور فتنہ کا سدباب ہو گیا۔

اس واقعہ کو عرصہ گزر چکا، میں بھارت میں ہوں اور صدیق صاحب پاکستان میں، لیکن ان کی کینہ پروری بدستور رہی ہے۔ رسالہ نقوش لاہور نے شخصیات نمبر شائع کیا، مولانا احسن مارہروی مرحوم پر صدیق صاحب کے نواسے "میاں جمیل زبیری" نے مضمون لکھا، اس مضمون کے بطون میں صدیق صاحب جلوہ گر ہوئے اور اپنے اُستاد مرحوم کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

سینے میں کیوں خدنگِ نظر دل کو چھوڑتا   ساری نگاہ گہ میں وہی اک شکار تھا

مجھ پر رکیک انداز میں حملہ کیا۔ جہاں تک میرا سوال ہے مجھے اپنے عیوب پر اطلاع ہے۔ اگر ان عیوب میں واقعی کوئی "حقانیت" ہے تو میں ہر موقع و محل پر خود اقرار کرتا رہا ہوں[1]۔ لیکن مولانا مرحوم جیسے شفیق اُستاد نے صدیق صاحب کا کیا بگاڑا تھا کہ انھوں نے براہِ راست اگر نہیں تو بالواسطہ ہی ان کی توہین کر کے اپنی تہذیب کا ثبوت دیا۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ برسوں جس کے دسترخوان پر نمک کھایا! آج اس کی توہین کیا نمک حرامی میں شمار نہیں ہو سکتی۔

---

[1]۔ دیکھیے میری کتاب "سلمان اور نظریۂ شرافت" نظامی بک ڈپو، بدایوں۔

صدیق صاحب اس گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگوانے والے آپ ہی جیسے لوگ تھے، اگر آپ کے دل میں میری جگہ نہ تھی تو کوئی بات نہیں اور نہ اس کا میں شکوہ کرسکتا ہوں اس لیئے کہ ؎

خلش میرے دلِ مجروح میں جتنی بھی ہو کم ہے
ٹھہرتا ہے یہیں جو تیر چلتا ہے نگاہوں کا (احسنؔ)

لیکن آپ کو اس بدتمیزی سے پہلے یہ تو غور ہی کرلینا تھا کہ آپ کی بناوتوں، آپ کی ریشہ دوانیوں اور آپ کی غیر سعادت مندیوں سے قطع نظر کر کے جس طرح آپکے اُستاد آپ پر شفقت فرماتے رہے بالکل اسی طرح اُن کی اولاد میں اگر میں نہیں تو ایک سادہ لوح فرد اب بھی ایسا موجود ہے جو آپ کی ان حرکتوں سے واقف وآگاہ ہونے کے باوجود آپ پر اتنا مہربان ہے اور اتنا مٹا ہوا ہے کہ ۱۳ر جولائی ۱۹۶۰ء کو جب کراچی میں "احسن ڈے" منایا گیا تو آپ کو مولانا مرحوم کے مخصوص شاگرد کی حیثیت سے نمایاں کئے بغیر نہیں رہا، مگر آپ اپنی ابن الوقتی' بے راہ روی سے باز نہیں آتے، سچ ہے ؎

آجکل احسنؔ دروغ و رشک و غلیبت کے سوا
رہ گئی ہیں اور کیا باتیں سُخنداں کے پاس

مولانا احسنؔ کی تصانیف :-

مولانا احسنؔ مارہروی مرحوم کی تصانیف کی تعداد بہت کافی ہے جن کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جو مولانا کے ہی قلم و ذہن کا رہینِ منّت ہے لیکن کتاب دوسروں سے منسوب ہے؛ درحقیقت یہ کتابیں وہ ہیں جو مرحوم نے بعض ناشروں کی فرمائش سے لکھیں اور ان کی تالیف کے حقوق انھوں نے فروخت کردئیے اور اس طرح ہم لوگ ہی جان سکتے ہیں کہ مولانا کے کتنے اور کیسے ادبی کارنامے دوسروں

کے ناموں سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ مولانا مرحوم کی وہ کتابیں جو ان کے نام سے شائع اور مطبوع ہوئیں اور جن کے نام مجھے معلوم ہو سکے یہ ہیں:۔

"مجمع البرکات، اُردو لشکر، ریاض سخن، ریاض خلیل، جلوۂ داغ، فصیح اللغات فصیح الملک، تحفۂ احسن، یادگار داغ، چُپ کی فریاد، کسوف الشمین قوم کا مطالبہ، علی گڈھ کالج کی فریاد، تخمیسین، دیوان ولی، تاریخ نثر اُردو، کارنامۂ غم، خطوط غالب، چند منظوم، احسن الادب، شاہکار عثمانی، منتخب داغ، انشار داغ"

مولانا مرحوم کی مفصلۂ بالا تصانیف جن پر خط کھنچا ہوا ہے ان کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکا ہے باقی کتابوں میں "اردو لشکر" مولانا کی ایک طویل نظم ہے جو اُردو زبان کی اہل اور اس کے ارتقا پر منظوم بحث ہے اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ سب سے پہلی نظم ہے جو بہت پسند کی گئی اور اس کی جداگانہ اشاعت وطباعت کی ضرورت محسوس کر کے مولانا نے شائع کرادی، اب یہ نظم نایاب ہے۔

بعض ضرب الامثال کو عنوان بنا کر مولانا نے بچّوں کے لئے کچھ نظمیں فرمائی تھیں، یہ نظمیں بہت مقبول و پسند ہوئیں اور "تحفۂ احسن" کے نام سے شائع ہوئیں دوسری اشاعت اس کی پاکستان سے ہوئی ہے۔ مولانا حالی نے چپ کی داد کے نام سے ایک نظم لکھی تھی جس میں عورتوں کی خاموشی، صبر و تحمّل اور برداشت پر بحث کرتے ہوئے ان کی قربانیوں اور ان کے ایثار کی داد دی تھی، مولانا احسن نے اس زمانے میں "چُپ کی فریاد" کے نام سے ایک نظم فرمائی جو بہت مقبول ہوئی یہ دونوں نظمیں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو یکجائی صورت میں ایک اجمالی مقدمہ کے ساتھ سال گذشتہ شایع کرادیا ہے[۱]۔

---

[۱] نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

مولانا حالی اور مولوی شبلی کی وفات سے مولانا احسن اتنے متأثر ہوئے کہ بطور نوحہ ایک نظم کہہ ڈالی یہ نظم ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی "کسوف الشمسین" نام رکھا، کتاب چونکہ نایاب ہوچکی ہے لہذا اس کو اس کتاب میں شائع کیا جارہا ہے نظم کی خوبی اور مولانا کے جذبات سے لطف اٹھائیے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں قومی آزادی کے زیر اثر ترک موالات کی تحریک بہت زوروں پر تھی، مولانا تحریک آزادی کے قائل ضرور تھے لیکن ایسی تخریب کے وہ کبھی قائل نہیں رہے کہ جس سے قوم کے بنیادی مفاد زد میں آئیں، ان کی نظمیں "قوم کا مطالبہ" اور "علی گڈھ کالج کی فریاد" مولانا کے صحیح جذبات کی آئینہ دار ہیں، یہ دونوں نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کافی تعداد میں چھپیں۔ اب نایاب ہیں

محسن کاکوروی کی ایک مشہور نعت پر مولانا مرحوم نے مصرعے لگائے تھے، اور "تخمیس" کے نام سے شائع بھی کیا تھا اس کا مقدمہ بڑا مبسوط ہے جس میں محسن کاکوروی کی شاعرانہ خصوصیات پر کافی بحث کی گئی اور نعت گوئی سے متعلق بڑی کارآمد بحث اس کتاب میں موجود ہے۔

ولی دکنی اُردو کے اوّلین شعراء میں شمار ہوتے ہیں لیکن ابنائے زمانے کی غفلت شعاری سے اُردو شاعری کے باوا آدم کی جائے پیدائش، سنہ ولادت زمانۂ وفات اور زندگی کے دوسرے عام حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ مولانا مرحوم نے اس کمی کو محسوس فرمایا اور اُردو شاعری کے اس مجددِ اعظم کو سب سے پہلے متعارف کیا، کتاب انجمن ترقیِ اُردو ہند نے ٹائپ میں شائع کی تھی۔ بڑی ضخیم کتاب ہے جس کا مقدمہ بہت مکمل اور جامع ہے۔ مولانا مرحوم کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو افادیت کے اعتبار سے اُردو لٹریچر میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔ اس کتاب کا نام "کلیات ولی" ہے۔

اُردو زبان کی تحقیق سے مولانا احسن مارہروی کو خاص لگاؤ تھا، وہ ہمیشہ اُردو زبان کی درستی اور ستھراؤ کے لئے کوشاں اور بے چین رہا کرتے تھے اسی جذبہ کا ثبوت مولانا کی معرکۃ الآرا تصنیف ہمارے پاس "تاریخ نثر اُردو" ہے، گو اس کتاب کے بعد اور دوسری کتابیں بھی اُردو ادب کی تاریخ پر شائع ہو چکی ہیں لیکن تاریخ نثر اُردو کو خشتِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے اور اسی کی بنیاد پر دوسرے اہلِ قلم حضرات نے نئے اور مختلف انداز کی چیزیں پیش کیں، افسوس اس کتاب کی دوسری جلد مولانا مرحوم ترتیب نہ دے سکے۔ حالانکہ مواد سب موجود تھا، وہ مواد میری دست رس سے دور ہے ورنہ تاریخ نثر اُردو کی دوسری جلد ضرور طبع اور شائع ہوتی۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس کا کچھ حصہ اثنا عشری عقائد کا حامل ہے۔ لہٰذا ماہ محرّم میں خاندان میں جگہ جگہ مجلسیں ہوا کرتی تھیں، واقعہ کربلا اور حضرت امام حسینؑ کی دردناک داستان کے اذکار ہوتے مولانا بزرگ خاندان ہونے کی حیثیت سے ان مجالس میں شریک ہوتے اور چونکہ شاعر تھے لہٰذا ہر موقع پر اپنے طبعزاد کلام سے حاضرینِ مجلس کو مائلِ گریہ کرتے، ایسے تمام نوحوں، سلاموں اور رباعیوں وغیرہ کا مجموعہ "کارنامۂ غم" کے نام سے شایع ہوا

غالب کے خطوط پر مشتمل کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن بعض انشائی خامیوں اور لسانی بے احتیاطیوں کا شکار ہیں۔ مولانا مرحوم نے اس کمی کو محسوس فرمایا اور طلباء کے مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر "خطوط غالب" کا ایک ایسا مجموعہ پیش کیا جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے سب سے بہتر متصور کیا گیا۔

مولانا کی بعض مخصوص اور پسندیدہ نظموں کا ایک مجموعہ "چند منظوم" کے نام سے شائع ہوا، اس کتاب کی بعض نظمیں اس مجموعہ میں بھی شامل ہیں، یہ مجموعۂ نظم بھی

طلبار کے استفادے کی خاطر سے شائع کیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے بعض کتابیں خالصاً طلبار کے لئے لکھی تھیں، ان نظم و نثر کی کتابوں میں "احسن الادب" اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب یونیورسٹی کے طلبار کے کورس میں شامل رہی۔ اس کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ مشکل لفظوں کی ہی اس کتاب میں تشریح نہیں کی گئی ہے بلکہ محاوروں اور تلمیحوں کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔ ہر غزل یا نظم کے بعد وزن بھی دئے گئے ہیں اور ایسی عروضی بحث کی ہے جو طلبا، کیلئے بہت کارآمد ہے، عروض، بیان اور بدائع کی ابتدائی و ضروری معلومات بھی درج کردی گئی ہیں، ہر شاعر اور نثار کی سوانح عمری، کلام کی خصوصیات پر مناسب بحث بھی کی گئی ہیں، الغرض یہ کتاب کورس کی کتاب ہونے کے باوجود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم کی مفصلہ بالا تصانیف و تالیفات پر بہت ہی مختصر بحث کی گئی ہے ورنہ یہ سب کتابیں مفصل و مشرح مقالات کی محتاج ہیں، مولانے اپنی عمر کے تقریباً ۵۰ سال اُردو زبان کی خدمت میں گذارے تھے صدہا کتابوں کے علاوہ ہزاروں مختلف مضامین ان کے قلم سے نکلے اور موقت الشیوع رسالوں میں شائع اور مطبوع ہوتے رہے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولانا مرحوم کے تمام رشحات قلمی خواہ نظم ہو یا نثر مختلف چوٹی کے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور آج اگر کوئی ان کے کلام کو جمع کرنا چاہے تو مختلف رسائل اور کتابوں کی تلاش اور پھر ان کی ورق گردانی کی زحمت تو ضرور برداشت کرنی ہوگی لیکن مرحوم کا تمام و کمال کلام حاصل ہو جائے گا۔[1]

مولانا مرحوم کی وفات کے بعد ہمیں ان کے قلمی متروکات میں چند غیر مطبوعہ

---

[1] ۔ مولانا کے مضامین نثر کا بھی ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ خدا اس کے تکملہ کی مجھے توفیق عطا فرمائے

مسودے بھی ملے، سب سے قدیم مسودہ جو ملا وہ "تواریخ حزن و بکا" کے نام سے اُن قطعاتِ تاریخی کا مجموعہ ہے جو مولانا نے اپنے والد کی وفات سے متاثر ہو کر ۱۰ سال کی عمر میں فرمائے، ایسے کافی قطعات ہیں لیکن وہ فارسی زبان میں ہیں جو موجودہ بھارت میں شائع کر دیے جائیں تو بے موقع راگنی کے مصداق ہوں گے لہذا خاندانی تبرک کے طور سے وہ میرے پاس محفوظ ہیں، دوسرا مسودہ ان قطعات و مراثی کا ہے جو نواب مرزا خاں داغ کی وفات پر ان کے شاگردوں اور احباب نے کہے تھے، مولانا نے ان سب کو حاصل کر کے بہ غرض طباعت تیار کیا تھا لیکن حسب موقع وہ اسے شائع نہ کر سکے۔ اب پچاس سال کے بعد اس کی اشاعت بے معنی سی بات ہوگی، اس مسودے سے وہ مرثیہ جو مولانا نے فرمایا تھا اس کتاب میں دے رہا ہوں گو یہ اس سے پہلے بھی شائع ہو چکا ہے لیکن اب نایاب ہے۔ تیسرا مسودہ مجھے مشاہیر شعراء و ادباء کے خطوط پر مشتمل ایک مجموعہ میں ملا جس میں مرحوم نے تقریباً ہندوستان کے تمام ان چوٹی کے شعراء و ادباء کے خطوط جمع فرمائے ہیں جو وقتاً فوقتاً انھیں موصول ہوئے، علاوہ اس مختصر مجموعۂ خطوط کے اصل خطوط کا انبار بھی مجھے ملا جس میں بڑے بڑے گوہر نایاب موجود ہیں اور میں ان قیمتی جواہر پاروں کو جان کے برابر محفوظ کئے ہوئے ہوں، اتنا وقت نہیں ملتا اور نہ ہمت افزائی ہوتی ہے کہ ان جواہر ریزوں کو مستقل تالیف کی شکل میں ترتیب دے کر پیش کر سکوں ان ادبی خطوط کی کچھ جھلک میں رسالہ شاعر آگرہ اور کچھ رسالہ "نقوش" لاہور، میں دکھا چکا ہوں۔

چوتھا مسودہ مجھے داغ کے پرائیویٹ حالات پر مشتمل ملا جو کچھ تو مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی نے اور کچھ مولانا مرحوم نے لکھا تھا۔ یہ دوران قیام حیدرآباد میں جیسا کہ سابقہ اوراق پر لکھ چکا ہوں تیار ہوا تھا، اس کے کچھ ابواب

مولانا نے اپنے بعض مضامین میں پیش کیے تھے میں نے اس پورے مسودے کو کارآمد پا کر کافی دنوں کی کوشش کے بعد از سر نو ترتیب دیا اور بزم داغ کے نام سے نسیم بکڈپو لکھنؤ سے شائع کروا دیا۔

مولانا مرحوم کے قلمی متروکات میں پانچویں چیز میرے پاس فصیح اللغات کے وہ چند اجزا ہیں جو محروم اشاعت رہے اور بطور تبرک میرے پاس محفوظ ہیں، چھٹی نادر چیز جو ہماری دسترس میں ہے وہ مولانا مرحوم کی وہ ڈائریاں ہیں جو مرحوم اپنے روزمرہ کے معمولات اور حالات کی تشریح میں لکھا کرتے تھے، یہ سلسلہ سنہ ۱۹۲۱ء سے شروع ہو کر شروع اگست سنہ ۱۹۴۰ء تک جاری رہا، گو یہ روزنامچے گھریلو حالات اور خانگی معاملات پر مشتمل ہیں لیکن مولانا مرحوم کی مفصل و مکمل لائف لکھتے وقت ان سے کبھی قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ گھریلو واقعات کے ساتھ ساتھ ان روزنامچوں میں بعض ایسی باتیں بھی درج ہیں جن کے حوالوں کے بغیر مولانا کی مکمل سوانح عمری ہرگز نہیں لکھی جا سکتی۔

مولانا مرحوم کی وفات کے بعد میں نے اپنا عندیہ وقت اس تلاش و جستجو میں صرف کیا کہ مرحوم کی لکھی ہوئی معمولی سے معمولی تحریر بھی ضائع نہ ہونے پائے اور وہ کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو جائے چنانچہ کاغذات کے زبردست انبار کا میں نے مکمل جائزہ لیا اور اگر مجھے کسی معمولی پرزے پر مولانا کی کوئی تحریر نظر آئی اسے حاصل کر لیا، آپ کو یہ سن کر یقیناً حیرت ہوگی کہ مولانا نے اگر کبھی کوئی یادداشت بلاٹنگ پیپر پر بھی لکھی یا کسی لفافے کے کونے پر بھی یادداشت درج کی میں نے اسے بھی محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سی ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جو مجھے دستیاب نہ ہو سکی ہوں بہرحال جس قدر اور جتنا مسالہ بھی میرے پاس ہے اسکے مواجہہ میں مولانا مرحوم کی ایک اتنی مکمل و مفصل لائف لکھی جا سکتی ہے جس میں مرحوم کی زندگی کے تمام رُخ بے نقاب ہو سکتے ہیں۔

سید رفیق مارہروی۔ داتا گنج ضلع بدایوں۔ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

غزلیات

ہاسمہ

ظاہر میں بہت کھوج لگایا تیرا پایا نہ سُراغ کچھ خدایا تیرا
لیکن جو حقیقت کی نظر سے دیکھا ذرّے ذرّے میں نور پایا تیرا

ایسی قربت کسی نے کب پائی ہے یہ یک جہتی کہاں نظر آئی ہے
احمدؐ کو احد سے کیا جدا سمجھیں ہم یہ نقشِ دوئی برنگِ یکتائی ہے

حمد باری

یہ ادنیٰ حمدِ خالق میں ہے آدابِ قلم میرا — کہ چلتا ہے تو سر کے بل ہی چلتا ہے قلم میرا
مجھے جلنے نہ دے سرد آہیں کہ شب بیدارِ فرقت میں — اُڑاتی ہے عبث خاکا نسیمِ صبح دم میرا
اذیت پاؤں تکلیفیں اٹھاؤں سختیاں جھیلوں — مگر ٹھوکر نہ کھائے راہ میں تیری قدم میرا
ترے جاں بخشیوں پر بھی ہوں اپنی جان کا دشمن — عجب ہے وہ کرم تیرا غضب ہے یہ ستم میرا
وہ بیکس تھا وہ بے بس ہوں کہ دُنیا میں اے احسن — نہ کوئی جیتے جی میرا نہ کوئی مرتے دم میرا

جو بگڑی ابتدا میری تو کچھ پروا نہیں اسکی
مگر ہو خاتمہ بالخیر احسن مرتے دم میرا

(١)

خود فراموش سے شکوہ کوئی کرتا کس کا — ہوش اپنا ہی نہیں اس کو تو وعدہ کس کا
کر گیا ہے متحیر اُسے جلوا کس کا — تاکتی رہتی ہے منہ نرگس شہلا کس کا
میرے گھر آتے ہوئے آپ کہاں جا نکلے — چل گیا آج یہ چلتا ہوا فقرا کس کا
رک گیا کہتے ہی کہتے کوئی کیا مطلب دل — چل گیا آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کس کا
اس سے کیا کام کہ آئینہ بنایا کس نے — دیکھنا یہ ہے کہ منہ اس نے دکھایا کس کا
کیا کرے عمر دو روزہ پہ کوئی سیر جہاں — کھیل ہے ختم خود اپنا ہی تماشا کس کا

کون تھا میرے سوا منہ کا نوالا احسنؔ
اور کھایا غم فرقت نے کلیجا کس کا

(۲)

یہاں بغیرِ فغاں شب بسر نہیں ہوتی
وہاں اثر نہیں ہوتا، خبر نہیں ہوتی

خلش جگر میں ہے دل کو خبر نہیں ہوتی
چبھی ہے پھانس اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتی

عبث ہے کل کے لئے التوائے مشقِ خرام
قیامت آج ہی کیوں فتنہ گر نہیں ہوتی

جو ان سے دُور ہے اس کیلئے ہیں چشم براہ
ہم ان کے پاس ہیں ہم پر نظر نہیں ہوتی

اجل کو رُد کیے کیا کہہ کے اُنکے آنے تک
کہ اپنی بات بھی اے چارہ گر نہیں ہوتی

وہ آ گئے ہیں تو آنسو ضرور پوچھیں گے
اب آنکھ کیوں مری اشکوں سے تر نہیں ہوتی

کمالِ بے ہنری سے غنی ہوں میں احسنؔ
مجھے ضرورتِ عرضِ ہنر نہیں ہوتی

(۳)

درد نے کھوئے ہوئے دل کی جگہ پائی ہے
اک بلا سر سے گئی ایک بلا آئی ہے

دیکھتی ہے وہ تڑپنے کا تماشا پھر دل
کیا اجل بھی ترے بسمل کی تماشائی ہے

کیا ہے دُنیا میں نمود اور نمائش کے سوا
زندگی ہم کو تماشے کے لئے لائی ہے

عشق رُسوا کنِ عالم ہے وہ احسنؔ جس سے
نیک ناموں کی بھی بدنامی و رسوائی ہے

(۴)

غم خلش و ساز ہیں ابتر ہے سازِ زندگی
زندہ ہیں لیکن نہیں کچھ امتیازِ زندگی

ہر نفس مضراب ہے ہر دل ہے سازِ زندگی
جب یہ رُکتے ہیں تو کھل جاتا ہے رازِ زندگی

نازِ قاتل پر فدا ہوگا نیازِ زندگی
جب قضا ہوگی، ادا ہوگی نمازِ زندگی

جان لے گی بے نیازی اس سراپا ناز کی
لوٹتا ہے جس کے قدموں پر نیازِ زندگی

شمع گھل گھل کر دیا کرتی ہو شعلے کو فروغ　　سوز ہے مظلوم کا ظالم کا سازِ زندگی
دل شکستہ ہوں مگر اُمید سے وابستہ ہوں　　بس یہی وابستگی ہے دل نوازِ زندگی

لے چلی ہو سوئے جنت حور و غلماں کی ہوس
مر کے بھی احسنؔ نہ چھوٹی حرص و آزِ زندگی

(۵)

کیوں چپ ہیں وہ بے بات سمجھ میں نہیں آتا
یہ رنگِ ملاقات سمجھ میں نہیں آتا

کیا دادِ سخن ہم تمھیں دیں حضرتِ ناصح
ہے تم کی یہ اک بات سمجھ میں نہیں آتا

شیخ اور بھلائی سے کرے تذکرہ تیرا
اے پیرِ خرابات سمجھ میں نہیں آتا

سایہ بھی شبِ ہجر کی ظلمت میں چھپا ہے
اب کس سے کریں بات سمجھ میں نہیں آتا

مشتاقِ ستم آپ ہیں مشتاقِ اجل ہم
پھر کیوں یہ رکا ہات سمجھ میں نہیں آتا

روکا انھیں جانے سے سرِ شام تو بولے
کیوں کرتے ہو تم رات سمجھ میں نہیں آتا

دل ایک ہے اور اس کے طلبگار ہزار دل
دیں کس کو یہ سوغات سمجھ میں نہیں آتا

کیوں کر کہوں احسنؔ کہ عدو دوست ہے میرا
ہو نیک وہ بدذات سمجھ میں نہیں آتا

(۶)

کیا لاؤں ایک شکوۂ فرقت زبان پر — ایسے تو سیکڑوں ہیں ستم میری جان پر
آئے تو تیرا ذکر کسی کی زبان پر — ہو غیر بھی تو چوم لوں موں اس بیان پر
دامانِ یار کی سی ہوا ہو کہاں نصیب — لاکھ اُڑ کے جائے خاک مری آسمان پر
تھا اُن کا ہم خرام ضرور اک نیاز مند — آنکھوں کے بھی نشاں ہیں قدم کے نشان پر

احسن کے جان و مال کا گاہک نہیں کوئی
ہوں گے نثار وہ کسی نامہربان پر

(۷)

تمہاری لن ترانی کے کرشمے دیکھے بھالے ہیں
چلو اب سامنے آجاؤ ہم بھی آنکھ والے ہیں
نہ کیوں کر رشکِ دشمن سے خلش ہو خارِ حسرت کی
یہ وہ کانٹا ہے جس سے پاؤں میں کیا دل میں چھالے ہیں
شبِ فرقت ذرا دم لینے کی فرصت نہیں ملتی
بڑی بے چین ہیں آہیں، بڑے بے صبر نالے ہیں
ہماری زندگی سے تنگ ہوتا ہے عبث کوئی
غمِ فرقت سلامت ہے تو کے دن جینے والے ہیں

(۸)

یہی دن رات دھیان ہے گویا — دل میں وہ مہمان ہے گویا
تیری تعریف سے نہ ہوگی بند — منہ میں جبتک زبان ہے گویا
وہ جو تم ہاتھ سے دو میرے لئے — زہر بھی پھول، پان ہے گویا

بے سہارے فلک پہ آہ گئی　　　تیر بے کمان ہے گویا
ہے یہ دل میں خیال کی وسعت　　　بند سارا جہان ہے گویا
ہیچ ہے سب جو ہم نہیں احسن
جان ہو تو جہان ہے گویا

(۹)

اپنے ہوتے ہوئے کیوں نامہ و پیغام چلے
ایسے دیسوں سے چلا ہے نہ کبھی کام سے چلے
ہم ہیں مشتاق قفس دام نہ پھیلا صیاد
لے اشارے پہ ترے بندۂ بے دام چلے
وقت پر اپنے سبھی جاتے ہیں دنیا سے مگر
ہائے بے وقت ہم اے عشق بد انجام چلے
ہم مِٹیں اور بلائے ہمیں کوئی احسن　　　کبھی اس طرح بھی در مئے گلفام چلے

(۱۰)

حسرت ناکام دل میں خار ہو کر رہ گئی　　　شکل راحت صورت آزار ہو کر رہ گئی
کیا دھرا ہو اس میں علیتی ہو نہ چل سکتی ہو یوں　　　تیغ ابرو نام کی تلوار ہو کر رہ گئی
آہ کو آنے دیا لب تک نہ ضعف قلب نے　　　نسل حسرت دل ہی میں ناچار ہو کر رہ گئی
ہجر کی شب یار کیسا موت تک آتی نہیں　　　وہ بھی صورت سے مری بیزار ہو کر رہ گئی
کیا شگفتہ ہو طبیعت احسن رنجور کی
وہ تو وقف کاہش و افکار ہو کر رہ گئی

(۱۱)

زباں کاٹ کر حکم آہ و فغاں ہے　　　نئے ممتحن ہیں نیا امتحاں ہے

اِدھر ایک عاجز ہے افتادہ منزل ‌‌ ‌ اُدھر ایک مغرور دامن کشاں ہے
مجھی کو اُٹھاتے ہیں محفل سے اپنی ‌ ‌ یہی ناز بردار اُن پر گراں ہے
یہ کہکر شب وصل پردہ اُٹھایا ‌ ‌ ہمارے تمہارے خدا درمیاں ہے

بُرا کہہ کے اَحسن کو خوش ہو رہے ہیں
یہی دل رُبا اُن کا حسنِ بیاں ہے

(۱۲)

میری غفلت نے بنایا ہادیٔ منزل مجھے
آنکھ والے چونک اُٹھے دیکھ کر غافل مجھے
کوئی حسرت ہے نہ ہی حسرت سے کچھ حاصل مجھے
سوچتا ہوں یا الٰہی کیوں ملا ہے دل مجھے
شورشِ بحرِ فنا سے پائی تسکینِ بقا
موجِ طوفاں میں ملا ہے دامنِ ساحل مجھے
چھان لی ہیں سب گذرگاہیں طریقِ عشق کی
پیش پا افتادہ ہے ہر جادۂ منزل مجھے
یہ تصرّف ہے تصوّر کا کہ اے محمل نشیں
کوئی پردا اب نظر آتا نہیں حائل مجھے
حسرتِ دیدار بھی در پردہ بسمل ہو گئی
قتل گہ میں جب نقاب اُلٹا ملا قاتل مجھے
چھوڑکر فریاد بے ہنگام نے تہذیبِ عشق
رازداروں میں نہ رکھا بات کے قابل مجھے
راہِ مقصد تک پہونچکر پا شکستہ ہو گیا

اب لیے بیٹھی رہے آرام سے منزل مجھے

عشق کی دُنیا کا ہے احسنؔ یہ حسنِ خاتمہ
لے چلی ہے حشر میں اُمیدِ مستقبل مجھے

(۱۳)

آنکھ لڑتے ہی جو ملنے کی نہ صورت ہوگی
ابتدا عشق کی تمہیدِ مصیبت ہوگی

ہے یہی فلسفۂ عشق کی معراجِ نیاز
خاک ہو جاؤں تو حاصل مجھے عزت ہوگی

رازِ الفت کو چھپانے میں نہ کھو ہوش و حواس
کہ یہی گم شدگی باعثِ شہرت ہوگی

عشق سے تجربۂ مرگ بھی حاصل ہوگا
زندگی میں کہیں مرنے کی ضرورت ہوگی

دے کے دل مطمئن الحال نہ ہوگا احسنؔ
بے دلی اور مری جان کو آفت ہوگی

(۱۴)

ہر طرف جس کے لبِ خاموش کا افسانہ ہے
وہ غریب اک شمعِ بزمِ ناز کا پروانہ ہے

دوست واعظ کے بھی ہیں ساقی سے بھی یارانہ ہے
توبہ ہو لب پر ہمارے ہاتھ میں پیمانہ ہے

داستانِ دردِ دل ہوگی مکمل موت سے
زندگی جب تک ہے ناقص عشق کا افسانہ ہے

شمع گھل گھل کر یہ کہتی ہے زبانِ حال سے
میری جاں سوزی میں اظہارِ غمِ جانانہ ہے

کیا طلسماتِ تصور ہے دلِ پُر آرزو
یعنی اک دم میں ابھی آباد ابھی ویرانہ ہے

میں لُٹاتا ہوں ابھی سرمایۂ ہوش و خرد
تم یہ کہدو اپنے منھ سے تو میرا دیوانہ ہے

آبروئے عشق وابستہ ہے سلکِ ضبط سے
احسنؔ اک اک اشک اپنا گوہرِ یکدانہ ہے

(۱۵)

قیامت خیز تھا اُٹھنا تری نیچی نگاہوں کا
کہ برپا ہو گیا دُنیا میں اک ہنگامہ آہوں کا

صفِ محشر میں آتے ہی جھکا لی شرم سے گردن — کیا منہ بند یوں اُس نے ہزاروں دادخواہوں کا
خلش میرے دلِ مجروح میں جتنی بھی ہو کم ہے
ٹھہرتا ہی یہیں جو تیر چلتا ہے نگاہوں کا

(۱۶)

رہ کے دُنیا میں جُدا کیا ہو بشر دُنیا سے — زندگی بھر نہیں دُنیا کا سفر دُنیا سے
کیوں زمانے میں دلِ شیفتہ رُسوا ہوتا — عشق کا راز نہ کہتے ہم اگر دُنیا سے
تو نہ آیا جو عیادت کو تو پھر فائدہ کیا — بھر گیا گر ترے بیمار کا گھر دُنیا سے
جب سے پیدا ہوئے ہم سیرِ عدم جاری ہے — سانس کے ساتھ ہے آغاز سفر دُنیا سے
یہ محبت ہے کہ توہینِ محبت احسنؔ
عشق اور عشق بھی اک شعبدہ گر دُنیا سے

(۱۷)

سُنیں گے شوق سے وہ داستاں کیا میری — کہ حرف حرف ہے گویا اک التجا میری
ستم کا شکوہ کروں میں مجال کیا میری — مگر خطا تو خدا کے لئے بتا میری
اثر کے پاؤں پڑی عرش کے قدم چومے — کسے کسے نہ مناتی پھری دُعا میری
وصال و ہجر میں یکساں ہے اسکا ذکر و خیال — یہ اپنی وضع نہیں چھوڑتی وفا میری
طلسمِ عشق نظر بند کر گیا ہے مجھے — نگاہ کس پہ اُٹھے گی ترے سوا میری
طمع ہے دل کی تو عاشق کے ہاتھ جوڑ دئے — یہ کیا کہا کہ خوشامد کرے بلا میری
ہوا ہوں حور کا طالب پہونچ کے مرقد میں — بڑھی ہے زندہ دلی کیا پسِ فنا میری
علاجِ عشق کا عیسیٰ پہ انحصار ہے کیوں — وہ آسمان سے لائیں گے کیا دوا میری
چلا ہے لے کے مجھے شوقِ دل وہاں احسنؔ
قبول ہو نہیں سکتی جہاں دُعا میری

(۱۸)

شہر چھوٹا پاؤں ٹوٹے خانہ ویرانی ہوئی ‏ جستجوئے یار میں کیا کیا پریشانی ہوئی
ابتدائے عشق میں سوچا نہ کچھ انجام کار ‏ اب ہوئے رسوا تو کہتے ہیں کہ نادانی ہوئی
چرخ پر تہمت غلط معشوق پر الزام جھوٹ ‏ خود محبت عاشقوں کی دشمنِ جانی ہوئی
اک مری تصویر رکھ چھوڑو بطور یادداشت ‏ بھول جاتے ہو تم اکثر شکل پہچانی ہوئی

جان دے کر منزلِ اُلفت کو احسن طے کیا
میری مشکل کی بڑی مشکل سے آسانی ہوئی

(۱۹)

وعدہ ترا اے وعدہ شکن کیا نہیں ہوتا ‏ ہوتا ہے مگر یوں کہ وہ گویا نہیں ہوتا
نسبت سے ملا کرتی ہو چھوٹوں کو بڑائی ‏ ظاہر ہے کہ قطرہ کوئی دریا نہیں ہوتا
دُنیائے محبت کی عجب آب و ہوا ہے ‏ بیمار جو ہوتا ہے وہ اچھا نہیں ہوتا
جیسا غضب و قہر ہے تیرا ستم آرا ‏ ایسا نہیں کرتا کوئی ایسا نہیں ہوتا
ہم ظلم اُٹھاتے نہیں یا غم نہیں سہتے ‏ کیا کچھ تری خاطر سے گوارا نہیں ہوتا
اس کو خلشِ عشق کی لذت نہیں ملتی ‏ جس دل میں کوئی خارِ تمنا نہیں ہوتا

تارے تو چمکتے ہیں فلک پر مگر احسن
روشن میری قسمت کا ستارہ نہیں ہوتا

(۲۰)

مرنے والوں کی جو تیرے یہی کثرت ہوگی ‏ وقت سے پہلے بہت جلد قیامت ہوگی
پوچھوں کیا کاتبِ اعمال سو تقدیر کا حال ‏ بدنصیبوں کے مقدر میں مصیبت ہوگی
جاں بہ لب ہے ترا بیمار ذرا دیکھ تو آ ‏ اجر کا اجر عنایت کی عنایت ہوگی

کھو دیا موت نے سب لطفِ عیادت احسنؔ
اب نہ یہ دن کبھی ہوگا نہ یہ ساعت ہوگی

(۲۱)

کر چکی آزاد میری خانہ ویرانی مجھے
اب جہاں جی چاہے لے چل اے پریشانی مجھے

ہائے وہ تلوار کھینچیں اور میں بسمل ہوں
کھل رہی ہو آج کیا میری گراں جانی مجھے

ماتمِ دشمن میں انکے ساتھ ہوں دل سے شریک
آج خوش کرتی ہو میری اشک افشانی مجھے

کر دیا سر پھوڑ کر دیوارِ زنداں میں شگاف
کیوں دعائیں دیں نہ دل سے اوزندانی مجھے

سچ ہو دنیا میں بڑی مشکل ہو عزت دار کو
کی ہیں دشمن نے خطائیں ہو پشیمانی مجھے

(۲۲)

اٹھی نگاہ مگر دل اک اضطراب میں ہو
خطا کسی سے ہوئی ہو کوئی عذاب میں ہو

جو ہو پسند تو ان خستہ حالیوں پر بھی
جگہ کسی کی دلِ خانماں خراب میں ہو

بڑا کرم ہو یہ اے حسنِ اتفاق ترا
جو ہم سنیں کہ رقیب آجکل عتاب میں ہو

گیا نماز کی خاطر گلے پڑے روزے
ثواب کیلئے زاہد بڑے عذاب میں ہو

جو پھر گئی نظر ان کی تو کیا گلہ احسنؔ
انھیں پہ کیا ہو زمانہ ہی انقلاب میں ہو

(۲۳)

قدم ڈر ڈر کے یوں ابنارہِ الفت میں ٹکتا ہو
کہ دیکھیں کون ملتا ہو مقدر کس سے لڑتا ہو

خدا دیتا ہے رعنائی تو نخوت آ ہی جاتی ہو
حسیں تو پھر حسیں ہیں سروِ گلشن تک اکڑتا ہو

تباہی دیکھ کر دل کی کلیجہ کیوں نہ پھٹ جائے
رہا پہلو بہ پہلو ساتھ جس کا وہ بچھڑتا ہو

بھلا یہ چیز ایسی ہو کہ دیوار دل پہ چسپاں ہو
تری تصویر احسنؔ دل کے آئینے میں جڑتا ہو

(۲۴)

جو تیر دل میں آئے وہ ارمان ہو گئے ہم شکل میزباں مرے مہماں ہو گئے
اچھا بندھا تصوّرِ گیسو فراق میں بیٹھے بٹھائے ہم تو پریشان ہو گئے
دوں تیر بے خطا کی ترے داد کس طرح پہلے سے ہی خطا مرے اوسان ہو گئے
اپنے جمال ہوش رُبا پر نظر نہ تھی دیکھا جو آئینہ تو وہ حیران ہو گئے
دل کیا گیا کہ جان گئی، آبرو گئی اک عشق کے سبب کئی نقصان ہو گئے

احسن مکیں ہے دل کی تباہی کا کیا گلہ
گھر ایسے ایسے کتنے نہ ویران ہو گئے

(۲۵)

خوشی اسکی اگر دلمیں نہ اک دم بھی خوشی ٹھہری کروں کیا میرے غمخانے کی قسمت ہی یہی ٹھہری
خدا کی شان وہ میری دُعا کو بد دعا سمجھے عجب اُلٹا زمانہ ہو کہ نیکی بھی بدی ٹھہری
نہ دفتر کھول تو اے نامہ بر اتنا بتا مجھ کو گیا تھا جس غرض سے تو وہاں وہ بات بھی ٹھہری
دمِ آخر کہی اچھی کہ آؤ کچھ ہنسیں بولیں ہماری جانکنی گویا تمھاری دل لگی ٹھہری

قیامت بھی اسی دن احسن اپنا سر اُٹھائے گی
ہماری سانس جس دن چلتے چلتے اک گھڑی ٹھہری

(۲۶)

رہے مایوس بن کر کیوں تمنائے دلی میری سُنے گا کیا نہ کچھ تیری طرح اللہ بھی میری
بس اب رہنے بھی دو بیکار حجت کیوں بڑھاتے ہو تم اچھے، غیر اچھا، میں بُرا، قسمت بُری میری

کہوں کس کس سے کیا کیا حال احسن رنجِ فرقت کا
جسے جو پوچھنا ہو دیکھ لے وہ شکل ہی میری

(٢٧)

آنکھ میں جب آنکھ ڈالی جائے گی — پھر طبیعت کیا سنبھالی جائے گی
بے سبب وہ اور حالِ دل سنیں — ہو نہ ہو کچھ نئی نکالی جائے گی
سرد آہیں بھر نہ منعم وقتِ مرگ — ایک دنیا ہاتھ خالی جائے گی
وہ اٹھائیں اور مجھ بیکس کی لاش — خاک بھی مجھ پر نہ ڈالی جائے گی
غیر پر بات آنے دیں گے وہ غلط — اس پہ رکھ کر مجھ پہ ڈھالی جائے گی

دیتے ہو احسن دلِ ناکام انھیں
یہ نکمی چیز کیا لی جائے گی

(٢٨)

کھولی کمند اس نے جو زلفِ سیاہ کی — تصویر کھینچ دی مرے حالِ تباہ کی
جو تیری تاک ہے وہی دزدِ نگاہ کی — کیا یہ ملی بھگت نہیں چور اور شاہ کی
رسوائیوں کے ڈر سے کھڑے ہیں وہ دم بخود — کیسی بندھی ہوئی ہو ہوا میری آہ کی
عاشق تو ہو گیا ہوں انھیں دیکھ کر مگر — آتی نہیں نظر کوئی صورت نباہ کی
تھی کج روی ضرور مگر ہائے بیکسی — تیری تلاش کیلئے دشمن سے راہ کی
تقصیر ان کی حشر میں ثابت جو ہو گئی — حسرت سے دیکھنے لگے صورت گواہ کی
ایسے ستم ظریف سے کیا پیش چل سکے — ہم نے جو آہ کی تو ستمگر نے واہ کی
پھرتے ہیں منہ چھپائے ہوئے وہ ادھر ادھر — محشر میں بن پڑی ہے دلِ داد خواہ کی
محشر میں بھی چلیں گے جو آئے ہیں تا قبر تک — لیکن ذرا تھکن تو اتر جائے راہ کی

گھر تیرا احسن اور خراباتیوں کا شور
اے خانماں خراب یہ گت خانقاہ کی

(۲۹)

گھر مرا بننے نہیں دیتی پریشانی مری — خاک اُڑاتی پھر رہی ہے خانہ ویرانی مری
ہوں اگر نادم تو کچھ فکرِ سیہ کاری نہیں — سرخروئی مجکو بخشے گی پشیمانی مری
میرے دل کو حاصل اطمینانِ کلی ہو گیا — بڑھ گئی حد سے زیادہ جب پریشانی مری
کیوں بنوں کم حوصلہ کیوں قتل سے روکوں اُسے — خود سبک کر دے گی قاتل کو گرانجانی مری

اور کیا رکھا ہے اسمیں رنج و حسرت کے سوا
سرگزشتِ درد ہے احسن غزل خوانی مری

(۳۰)

مجال تھی جو یہ سب اہلِ فغاں ہوتے — اک امتحان نہیں لاکھ امتحاں ہوتے
عدو کی بزم میں ہم اور میہماں ہوتے — تمھارا پاس نہ ہوتا تو کیوں وہاں ہوتے
صراطِ عشق سے ہو دور ورنہ حضرتِ خضر — تمھیں بھی زیست کے یہ دن وبالِ جاں ہوتے
ہمارے پاس بھی دل ہے ہمیں بھی حسرت ہے — کبھی تو زیرِ فلک ہم بھی شادماں ہوتے

تمھارے وصل کی ہے آس ورنہ احسن کو
غمِ فراق کے صدمے وبالِ جاں ہوتے

(۳۱)

دل میں بٹھا کے اُن کو مزا کیا اُٹھائیے — اس کے سوا کہ زحمتِ بے جا اُٹھائیے
مٹیے، تباہ ہوجیے، ایذا اُٹھائیے — احسان جیتے جی نہ کسی کا اُٹھائیے
آدابِ محفل آپ کا معلوم ہو گیا — بہتر نکالئے ہمیں اچھا اُٹھائیے

احسن یوں ہی نہ دیجیے اُس مفت بر کو دل
جب تک نہ خوب لطفِ تقاضا اُٹھائیے

(۳۲)

ہستی ہے اپنی جن کے لئے ہم گذر گئے — وہ دن کہاں گئے وہ زمانے کدھر گئے
مژگاں نے آنسوؤں کو بھنور سے بچالیا — تنکے کا آسرا جو ملا پار اُتر گئے
اللہ ری شہرتیں تری اے عالم آشنا
تیرا ہی ذکرِ خیر سُنا ہم جدھر گئے

(۳۳)

جو پائمال سرِ رہ گذار ہوتا ہے — یہی حقیر یہی خاکسار ہوتا ہے
نہ بھول وعدہ فراموش وقتِ نزع مجھے — تمام آج ترا انتظار ہوتا ہے
جُدا ہی سب سے مرے اعتمادِ عشق کی شان — وہ جھوٹ کہتے ہیں اور اعتبار ہوتا ہے
فضول ہو تمھیں احسن ملال بدنامی
کہ عشق کا یہی انجام کار ہوتا ہے

(۳۴)

وصل کا تیغ کو دُہرا یہ مزا ملتا ہے — ہاتھ قاتل کا تو بسمل کا گلا ملتا ہے
خضر کی راہ جُدا چرخ کی رفتار الگ — جس پُرانے سے ملو لُطف نیا ملتا ہے
پھرتے پھرتے درِ دشمن پہ جو پہونچے تو کھُلا
وہ تو ملتا نہیں ہاں اس کا پتا ملتا ہے

(۳۵)

خدنگِ ناز پہلو میں تو پیکاں دل میں رہنے دو — ستم کی یادگاریں سب تنِ بسمل میں رہنے دو
جو بھولے سے مری یاد آگئی ہو دل میں رہنے دو — تھکا ماندہ مسافر ہو اسے منزل میں رہنے دو
ہمیں اٹھواتے ہیں وہ بزم سے ان استعاروں میں — پتنگوں کو اُڑا دو شمع کو محفل میں رہنے دو

اگر ہو وصل ناممکن تو ہے دیدار تو ممکن — یہ آسانی کی صورت ہی مری مشکل میں رہنے دو
زباں کاٹو ہماری لب سیو رکھو حراست میں — گوارا ہی یہ سب کچھ تم اگر محفل میں رہنے دو
دمِ بسمل کسی کا خون بے حسرت بصد حسرت — یہ کہتا ہے کہ مجھ کو دامنِ قاتل میں رہنے دو
نہ کچھ باتیں سنو اُسکی نہ سرگوشی کرو اس سے
بنا کر محوِ دید احسنؔ کو تم محفل میں رہنے دو

(۳۶)

کس طرح کہے کوئی کہ غم دل سے جدا ہے — کیا غم کا ٹھکانا بھی کہیں دل سے جدا ہے
اصنام کو بے فائدہ بدنام کیا ہے — اس عہد میں ہر بندۂ خود رائے خدا ہے
دل فطرت و قسمت کی دو عملی میں گھرا ہے — آزاد طبیعت ہے، گرفتار بلا ہے
جو تم سے ملے گا وہ کسی سے نہ ملے گا! — یہ ضابطۂ عشق بہ آئینِ وفا ہے
کچھ تجھکو خبر بھی ہے وہ دیوانہ ہے تیرا — تو جس کو تماشے کی طرح دیکھ رہا ہے
ہے عالمِ اسباب میں ہر غم کا مداوا — ناپید مگر دردِ محبت کی دوا ہے
کر ختم مری زندگی و موت کا جھگڑا — قبضے میں ترے تیغ ہے مٹھی میں قضا ہے
غیر اور سنیں حالِ دل اللہ کی قدرت — تم اور نہ کچھ میری سنو شانِ خدا ہے
آنکھ ان کی ملی، ہاتھ ملا، دل نہیں ملتا — مل جائے اگر دل بھی تو ملنے کا مزا ہے
احسنؔ میں کوئی عیب بظاہر نہیں پایا
کیا جل کے وہ کہنے لگے یہ نام بڑا ہے

(۳۷)

حسرت ہے کہ دل میں آرزو ہے — جو کچھ ہے وہ میری جان تو ہے
جس کی دنیا کو ہے تمنا — اُس کی مرے دل کو آرزو ہے
لکھتے ہیں رقیب مجکو جو کچھ — گویا وہ تمھاری گفتگو ہے

اس شوخ نے پونچھے میرے آنسو — ان موتیوں کی یہ آبرو ہے
ہر بات پہ دے رہے ہو گالی — یہ بھی کوئی طرز گفتگو ہے
کس کس کی کریں شکایت احسنؔ
جب دل ہی ہمارا خود عدو ہے

(۳۸)

مسجد و کعبہ میں پرستش نہ صنم خانوں میں — بُت پرستوں میں نہ ہم ہیں نہ مُسلمانوں میں
سب سمجھتا ہوں رقیبوں کے کنائے دل میں — مجکو نادان نہ سمجھے کوئی انجانوں میں
کچھ ہمیں خبط نہیں عشق میں مجنوں کی طرح — کیوں ترے کوچے سے جانے لگے ویرانوں میں
اور ہے کون جو آکر مرے دل میں رہتا — اک تصوّر ہی فقط آپ کے مہمانوں میں
وہ بلانوش ہیں ساقی کہ اگر منھ سے لگے — ایک قطرہ بھی نہ چھوڑیں ترے پیمانوں میں
ہم سے کیا نوک کی لیں خار مغیلاں احسنؔ
ہم قدم دیکھ کے رکھتے ہیں بیابانوں میں

(۳۹)

جسے دیکھو جہانِ عشق میں رنجور رہتا ہے — ہمیشہ اس خرابے میں یہی دستور رہتا ہے
اثر پیکاں میں تیرے زہر کا بھرپور رہتا ہے — جبھی تو دل میں زخم اور زخم میں ناسور رہتا ہے
ہوس ہی تجکو شہرت کی تو اے شہرت طلب مٹ جا — نہیں رہتا کہیں عنقا مگر مشہور رہتا ہے
کچھ اس کو حُسنِ بے پروا کی خاطر بھی تو کرنی تھی — بجا وہ ناز کرتا ہے بجا مغرور رہتا ہے
چھپائے لاکھ کوئی ٹٹیوں کی آڑ میں لیکن — ہمیشہ مے کشوں کی ناک میں انگور رہتا ہے
وہ کوئی اور ہوگا جو بُرائی تیری چاہے گا
ترا احسنؔ تو ان باتوں سے کوسوں دور رہتا ہے

(۴۰)

دل میں سوزِ غم ہے آنکھوں سے لہو جاری ہے
چمنستانِ محبت کی یہ گل کاری ہے

ہر نفس آنے ہی جانے کے لئے جاری ہے
زندگی کی تگ و دو موت کی تیاری ہے

دردِ دل کا نہیں کرتا کوئی دنیا میں علاج
چارہ سازی سے مجھے یاس بہ ناچاری ہے

جانِ محزوں سے یہ کہکر دلِ وارفتہ چلا
میرا قصہ تو ہوا ختم تری باری ہے

آتے رہتے ہیں وہی انکی جگہ صورتِ خواب
بے وفاؤں کے خیالوں میں وفاداری ہے

دل میں سب کچھ ہے زباں پر نہیں آتا کچھ بھی
یہ عجب طرح کی مجبوری و مختاری ہے

ہیں طلسماتِ محبت کے مناظر جلنے
فتنہ انگیز نگاہوں کی فسوں کاری ہے

نہ گھٹے سوزشِ دل لاکھ بڑھے ضبطِ سرشک
آگ پانی میں لگادے یہ وہ چنگاری ہے

ڈھونڈھتے کیا ہو خطا کاریٔ احسن کے ثبوت
وہ خطاکار تو خود مجرمِ اقراری ہے

(۴۱)

اس نے دل دیکھ لیا اس نے جگر دیکھ لیا
اپنا اپنا خلش درد نے گھر دیکھ لیا

درخورِ محفلِ جاناں ہوں یہ تقدیر کہاں
کبھی اُس راہ سے گزرا تو اُدھر دیکھ لیا

اب تک افسانۂ نیرنگ جہاں سنتے تھے
آکے باتوں میں تری شعبدہ گر دیکھ لیا

جب مجھے اک نگہِ ناز سے تسکیں نہ ہوئی
اُس نے پھر مڑ کے بہ اندازِ دگر دیکھ لیا

نہ ملی سیلِ حوادث سے کہیں مجکو پناہ
میں نے ساحل کو بھی با دیدۂ تر دیکھ لیا

مل گئی دادِ غمِ عشق کہ احسن اُس نے
سُن لیا قصۂ غم زخمِ جگر دیکھ لیا

(۴۲)

جب سے پہلو میں ہمارے دلِ نالاں نہ رہا — ایک بھی دُکھ نہ رہا ایک بھی ارماں نہ رہا
دل سے تنگ اسلئے دردِ غمِ پنہاں نہ رہا — میزباں بن کے رہا صورتِ مہماں نہ رہا
تیرے دیوانے کو آتی نہیں ترتیب لباس — جیب اگر رہ گئی ثابت تو گریباں نہ رہا
دردِ دل پوچھنے بیٹھے ہیں دمِ نزع وہ کیا — اب دوا کرتے ہیں جب قابلِ درماں نہ رہا
اُن کو آشفتہ مزاجوں کی خبر کیا رہتی — جن کا گیسو بھی کسی وقت پریشاں نہ رہا
کیا بڑھائی ہے مری آبلہ پائی نے سبیل — تشنہ لب آج کوئی خارِ مغیلاں نہ رہا
حُسن کے فیض سے دُنیا کبھی خالی نہ رہی — تم ہو موجود اگر یوسفِ کنعاں نہ رہا

احسنؔ گوشہ نشیں سے کوئی واقف کیا ہو
کہ کبھی نام و نمائش کا وہ خواہاں نہ رہا

(۴۳)

اس نے دو چار اشارے جو کئے ناز کے ساتھ — ہو گئی ساری خدائی بُتِ طنّاز کے ساتھ
دلبری کیلئے اُٹھّی تھیں وہ جس ناز کے ساتھ — چاہتا ہوں وہی نظریں اُسی انداز کے ساتھ
پھر تو ہر بات ہو غمّاز کی آواز کے ساتھ — نہ رہے سرمہ اگر چشمِ سخن ساز کے ساتھ
بلبل اب خاک ہے باقی جو کرے دل سیرِ بہار — اُڑ گیا رنگِ چمن بھی تری پرواز کے ساتھ
گردشِ چرخ کی پروا، نہ غمِ دورِ زمیں — ہم تو پھرتے ہیں تمہاری نگہِ ناز کے ساتھ
اے دل اسرارِ محبت کو نہ افسانہ بنا — کہ تری ساکھ ہو پوشیدگیِ راز کے ساتھ
مُسکراتے ہوئے جس طرح کیا ہے انکار — کبھی اقرار بھی کر لو اُسی انداز کے ساتھ

شیخ ہے کعبۂ خود ساز میں احسنؔ اور ہم
ابروئے یار کی محراب خدا ساز کے ساتھ

(۴۴)

بیٹھ نہ تمکنت پسند چھپ کے حریمِ ناز میں
دل کی دوا اُو دوش دیکھ رہ گزرِ نیاز میں

بن کے کسی کا نقش پا ہم نہ اُٹھائے اُٹھ سکا
عشق کا حسن دیکھنا ناز بھی ہو نیاز میں

شکوہ بغیر واسطہ ملنے کا اک ہی راستہ
ورنہ خدا ناخواستہ عذر نہیں نیاز میں

پیش نظر جو ہیں صنم سب ہیں وہی کے بیش و کم
دیکھ حقیقتِ حرم بُتکدۂ مجاز میں

نالۂ نفس کی کش مکش سازِ حیات مرگ ہے
دونوں جہان بند ہیں ایک ہوا کے راز میں

دے کے غلط تسلیاں لی گئیں اور چٹکیاں
تھی یہ ادائے جانستاں غمزۂ دلنواز میں

عشق کی ہیں جو حسرتیں احسنؔ اُٹھا یہ زحمتیں
جان کو پھونک سوز میں دل کو گھلا گداز میں

(۴۵)

کھو کے عقل و ہوش شاملِ تذ فاضل میں رہے
ہم نہ رہنے کے برابر اُن کی محفل میں رہے

تیر چٹکی میں نہ خنجر دستِ قاتل میں رہے
اک مرے پہلو میں بیٹھے اک گئے دل میں رہے

آپ جب تک میرے ارمانوں بھرے دل میں رہے
خلوتوں کے لطف حاصل مجکو محفل میں رہے

یوں رہا عمرِ رواں کے ساتھ دُنیا میں قیام
ہم سفر کرتے ہوئے ہر وقت منزل میں رہے

ایک دردِ دل کے صدہا قصۂ رنگیں بنے
غرق جب تک دستِ قاتل خونِ بسمل میں رہے

سُن کے عرضِ وصل بولے اور ہم کیونکر ملیں
خواب میں آئے خیالوں میں بھی دل میں رہے

عشرت افزائے چمن جب تک رہی فصلِ بہار
پھول بھی ہنستے ہوئے شورِ عنادل میں رہے

پردہ در ہے عہدِ حاضر دیکھئے کیا گُل کھلے
غنچہ رہ اب تک تو میرے گوشۂ دل میں رہے

بے خیالِ عشق احسنؔ پہلوئے انساں میں دل
یوں ہے جیسے ظرفِ خالی دستِ سائل میں رہے

(۴۶)

کہیں گلہ، کہیں شکوہ، کہیں ترانہ تھا　　ہزار ساز تھے ایک آپ کا فسانہ تھا
نہ تھے شباب کے دن خواب کا زمانہ تھا　　کھلی جو آنکھ تو ہر واقعہ فسانہ تھا
نہ ابتدا پہ نظر تھی، نہ انتہا کی خبر　　کدھر گیا وہ زمانہ عجب زمانہ تھا
وہ تیرِ ناز بظاہر جو تھا غلط انداز　　جگر خراش اُسی کا ہر اک نشانہ تھا
نہ حُسن میں تھی بناوٹ نہ عشق میں صنعت　　وہ سادگی کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا
مرے نصیب کی آزادیاں ازل سے نہیں　　نہ تھا قفس میں تو پابند آشیانہ تھا

پیے نہ اشک نہ کھایا غمِ فراق احسنؔ
ہمارے عشق میں یہ قحطِ آب و دانہ تھا

(۴۷)

توبہ سے لب بہ لب ہے پیالہ شراب کا　　گویا گنُاہ راہ نما ہے ثواب کا
جس دن سے تم نے دستِ تسلّی اُٹھا لیا　　گہوارہ بن گیا مرا دل اضطراب کا
ہنگامِ جلوہ کچھ نہ کھُلا چشمِ شوق پر　　اُڑنا حواس کا تھا کہ ہٹنا حجاب کا
تجدیدِ عہد نے پھر اُمیدیں اُبھار دیں　　گھر بس رہا ہے پھر دلِ خانہ خراب کا

اے آسماں نہ چشمِ حقارت سے دیکھ اسے
احسنؔ ہے ذرّہ خاکِ درِ بوتراب کا

(۴۸)

کیا ضرورت بے ضرورت دیکھنا　　تم نہ آئینے کی صورت دیکھنا
پھر گئیں بیمارِ غم کو دیکھ کر　　اپنی آنکھوں کی مروّت دیکھنا
دیکھنے والو ڈرے جاتے ہو کیوں　　گالیاں سُن لو تو صورت دیکھنا

ہے وہ جب دل میں تو کیسی جستجو ڈھونڈنے والوں کی غفلت دیکھنا
سامنے تعریف پیچھے گالیاں اُن کی منہ دیکھی محبت دیکھنا
جن کو باقی ہی نہ ہو اُمید کچھ ایسے مایوسوں کی صورت دیکھنا
صبح اُٹھ کر دیکھنا احسنؔ کا منہ
ایسے ویسوں کی نہ صورت دیکھنا

(۴۹)

مقدر آزما اے عاشقِ شوریدہ سر اپنا کہ اس نے وقفِ سجدہ کر دیا ہو سنگِ در اپنا
کسی کو عشق میں کوئی پڑا ہوگا نظر اپنا یہاں تو دل ہی اپنا ہے نہ جاں اپنی نہ سر اپنا
خلوصِ عشق غیریت مٹا دیتا ہے دُنیا سے محبت دوست کو دشمن بھی آتا ہے نظر اپنا
فنا پیشِ نظر ہے پھر بھی ہم جینے پہ مرتے ہیں بناتے ہیں مٹانے کیلئے دُنیا میں گھر اپنا
نیازِ عشق و نازِ حسن میں جب سے تعارف ہے برابر ذکر رہتا ہے اِدھر ان کا اُدھر اپنا
پھٹا دامن گریباں چاک دیکھا ان غریبوں کا جھجھک تم نے دکھایا چھپ کے حسنِ پردہ در اپنا
تصور ہے بیٹھے ہی بیٹھے لئے پھرتا ہے دُنیا میں
نہیں منت کشِ رفتار احسنؔ یہ سفر اپنا

(۵۰)

ہر خار لہو پی کے بنا پھول چمن کا یہ تازہ شگوفہ ہے مرے زخمِ کہن کا
سب کچھ سہی غنچوں کو تری بات نہ آئی ہر چند چرایا کئے مول تیرے دہن کا
آئے تھے عدم سے تو کہاں ہوش بجا تھے کچھ یاد نہیں حال ہمیں اپنے وطن کا
مُرجھایا ہوا غنچہ نہ دیکھا اُسے دیکھا کیا حال کہوں میں دلِ پُر درد و محن کا
بچپن کا زمانہ ہے، تکلف نہ بناوٹ عالم ہے نرالا ترے بے ساختہ پن کا
ہے دل پہ کوئی چوٹ اُٹھائے ہوئے احسنؔ انداز ہے پُر درد جبھی اُس کے سخن کا

(۵۱)

وہ مدعی کے ساتھ ہیں، ہم مدعا سے دُور / کوئی بُتوں کے پاس ہے کوئی خدا سے دُور
ثابت رہے زمیں، نہ سلامت رہے جبیں / سجدے مرے اگر ہوں ترے نقشِ پا سے دُور
رسمِ وفا جہاں سے ہوئی یوں کنارہ کش / ہو جیسے مدعا دلِ بے مدعا سے دُور
کہکر غلط مجاز و حقیقت کی داستاں / بندوں نے کر دیا ہے بُتوں کو خدا سے دُور
اپنی نمود چھوڑ کے دیکھو اُسے کہ وہ / دل سے قریب ہے مگر خود نما سے دُور
صورت خوشی کی مجکو نظر آئے کس طرح / دل غم سے چور، ہم دلِ غم آشنا سے دُور

احسن وہ پاس آتے ہی اُن کے فنا ہوا
ہونا تھا جو مرض نہ کسی کی دوا سے دُور

(۵۲)

دل ہے یک سو عاشقوں کا حال یکساں دیکھکر / یعنی اطمینان ہے سب کو پریشاں دیکھ کر
ایک دل، صدہا تمنائیں، ہزاروں حسرتیں / میزباں گھبرا گیا ہے اتنے مہماں دیکھ کر
اُٹھ گیا دنیا سے آنکھوں کا لحاظ و پاس بھی / بے مروّت ہنس دیا ہے مجکو گریاں دیکھ کر
دشتِ وحشت کو بھی تھا حفظِ مراتب کا لحاظ / اُن کا دامن نہ کیا میرا گریباں دیکھ کر

کیوں فریبِ حسن کی درپردہ ہو منت کشی
ہم اُٹھائیں گے تو احسن بارِ احساں دیکھ کر

(۵۳)

یوں شرم کے پردے میں شوخی کو چھپاتے ہیں / دل پہلے چرایا تھا اب آنکھ چراتے ہیں
تمکینِ محبت کو اے اشک نہ کھو بہہ کر / نظروں سے جو گرنے میں تکلیف اُٹھاتے ہیں
اُف رے قدر اندازی اللہ رے مشاقی / جب آنکھ ملاتے ہیں اک تیر لگاتے ہیں

کیا عہدِ جوانی کو ہم ہوش رُبا سمجھیں — آپے میں نہیں رہتے جب آپ میں آتے ہیں
اخفا ہے جفاؤں کا، اظہار وفاؤں کا — وہ جس کو مٹاتے ہیں قبر اس کی بناتے ہیں
کیوں شاد نہ ہو دشمن، مر کے ہی مرے احسن — پامالیٔ عالم سے وہ ہاتھ اٹھاتے ہیں

(۵۴)

خرامِ ناز نے کیا روح پھونکی بیقراروں میں — کہ جس نے حشر کی سی ڈالدی ہلچل مزاروں میں
ٹھہرنا ننگ، چلنا قہر، کیا راہِ جنوں طے ہو — بھری ہے آبلوں میں تمکنت، شوخی ہے خاروں میں
حریفِ بے جگر ہے صبر میرا ورنہ اے ظالم — دکھاتا دن کو تارے آہ سوزاں کے شراروں میں
رکیں کیا آشیاں کے خار و خس سے بجلیاں بلبل — ہوا کرتا ہے تنکوں کا سہارا کن سہاروں میں
نہ آنسو ضبط کے بس میں نہ آہیں صبر کے بس میں — بُرا ہو اے محبت پھوٹ تیرے رازداروں میں
شکارِ دل کی خاطر کیوں نگاہ سینہ کرتے ہو — اُڑا دیتے ہو تم ایسے نشانے تو اشاروں میں
اُمیدِ وصل، شوقِ دید، دردِ دل، غمِ ہجراں — یہی اچھے بُرے دو چار ہیں احسن کے یاروں میں

(۵۵)

دل عشق میں ناچار ہے معلوم نہیں کیوں — مجبور یہ مختار ہے معلوم نہیں کیوں
دل خوگرِ آزار ہے معلوم نہیں کیوں — جب دیکھئے بیمار ہے معلوم نہیں کیوں
جو کام زمانے میں ہو سب کے لئے آساں — میرے لئے دشوار ہے معلوم نہیں کیوں
ہم رند تو پھر رند ہیں، زاہد کو ہوا کیا — حوروں کا طلبگار ہے معلوم نہیں کیوں
شوخی تری تصویر میں تجھ سے بھی سوا ہے — پھر نقش بہ دیوار ہے معلوم نہیں کیوں
کوئی دلِ زخمی نہ ملا بے خلشِ درد — گلزار یہ بے خار ہے معلوم نہیں کیوں
کچھ اور بھی کیا حق کے سوا اس نے کہا ہے — منصور سرِ دار ہے معلوم نہیں کیوں
ہے روز کا معمول مگر خوابِ شبِ غم — مرنے سے بھی دشوار ہے معلوم نہیں کیوں
دُہرے ہوئے جاتے ہیں نزاکت سے کمر کی — پھر ہاتھ میں تلوار ہے معلوم نہیں کیوں

سوچے ہوئے وہ دل ہیں ہیں معلوم نہیں کیا　　خاموش لبِ یار ہے معلوم نہیں کیوں

سب خیر مناتے ہیں اسی کی مگر احسنؔ
تو جان سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں

(۵۶)

سنگِ در بن کر بھی کیا حسرت مرے دل میں نہیں　　تیرے قدموں میں ہوں لیکن تیری منزل میں نہیں
ان کی بزمِ ناز کیا ہے عالمِ تصویر ہے　　ہے یہ خاموشی کہ گویا کوئی محفل میں نہیں
پائمالِ صد جفا ہے اک دلِ ناکردہ کار　　تختۂ مشق اور کوئی بزمِ قاتل میں نہیں
بزم آرائی سے پہلے دیکھ او نادان دیکھ　　کون ہے محفل میں تیری کون محفل میں نہیں
ہو چکی مشقِ ستم بس اے ستم ایجاد بس　　اب تڑپنے کی سکت بھی تیرے بسمل میں نہیں

پوچھتا ہے آرزو احسنؔ کی تو کیا بار بار
تیرے ملنے کے سوا کوئی ہوس دل میں نہیں

(۵۷)

قاصد نہیں ادا سے ادائے پیام ہو　　مطلب یہ ہے کہ بات نہ ہو اور کلام ہو
باقی ہے شوق راہ میں کیوں کر قیام ہو　　ہاتھ آئیں اُن کے پاؤں تو منزل تمام ہو
کیا خوش ہو دل کہ ہے وہ جفا جو زمیں سے دور　　تم کیسے آسمان کے قائم مقام ہو
ہوں عشق و حسن میں نہ فراز و نشیب اگر　　بالائے بام ہو، نہ کوئی زیرِ بام ہو
فرماں روائے حسن کو ہوتا نہیں فروغ　　جب تک نہ عشق اس کا مدار المہام ہو

احسنؔ وہ سُن کے شکوۂ تشہیر کہہ گئے
ہم جانتے ہیں تم کو بڑے نیک نام ہو

(۵۸)

حسن در پردہ اگر مائلِ اظہار نہ ہو　　کوئی مشتاق نہ ہو، کوئی طلبگار نہ ہو

حسن کی شوخیوں کا آئینہ بردار نہ ہو — اے دل احساس نہ کھو، نقشِ بہ دیوار نہ ہو
دل نشیں بن کے رہے زخم و خلش کی لذت — ناوکِ ناز ترا وار تو ہو، پار نہ ہو
بے کسی پر دلِ مہجور کی رحم آتا ہے — ہائے وہ غم زدہ جس کا کوئی غم خوار نہ ہو
خنجرِ ناز کا یوں وار اُٹھا ہمتِ عشق — زخم ہو، درد نہ ہو، درد ہو اظہار نہ ہو
دل میں سب کچھ ہے زباں پر نہیں آتا کچھ بھی — ہم سا مجبور الٰہی کوئی مختار نہ ہو
دل وہ لیتے ہیں تو یوں منت کا احساں رکھ کر — لاؤ ہم لے لیں اگر کوئی خریدار نہ ہو

منتظر احسنِ عاصی کی ہے چشمِ رحمت
کیوں وہ مشتاقِ عطا ہو جو خطاوار نہ ہو

(۵۹)

مجھے خبر نہیں غم کیا ہے اور خوشی کیا ہے — یہ زندگی کی ہے صورت تو زندگی کیا ہے
فغاں تو عشق کی اک مشقِ ابتدائی ہے — ابھی تو اور بڑھے گی یہ لے ابھی کیا ہے
تمام عمر اسی رنج میں تمام ہوئی — کبھی یہ تم نے نہ پوچھا تری خوشی کیا ہے
تم اپنے ہو تو نہیں غم کسی مخالف کا — زمانہ کیا ہے، فلک کیا ہے، مدعی کیا ہے
صلاح کار بنایا ہے مصلحت سے اسے — وگرنہ ناصحِ ناداں کی دوستی کیا ہے
دلوں کو کھینچ رہی ہے کسی کی مست نگاہ — یہ دل کشی ہے تو پھر عذرِ مے کشی کیا ہے
مذاقِ عشق کو سمجھو گے یوں نہ تم ناصح — لگا کے دل کہیں دیکھو یہ دل لگی کیا ہے

وہ رات دن نہیں ملتے تو ضد نہ کر احسن
کبھی کبھی کی ملاقات بھی بری کیا ہے

(۶۰)

انھیں کا نام ہے دفتر میں ہر فسانے کے — یہ حسن و عشق ہیں فرماں روا زمانے کے
کھلے ہوئے یہی معنی ہیں مسکرانے کے — ہنسی ہنسی میں ارادے ہیں دل اڑانے کے

یہ بے رُخی کا ہے عالم کہ ہو رہا ہے گماں
نہ ہے زمانہ ہمارا نہ ہم زمانے کے
بہارِ حسن کی رنگینیاں نہ بدلیں گی
ہزار رنگ بدلتے رہیں زمانے کے
وقارِ ضبط نہ کھو چشمِ تر نہ اشک بہا
کہ بے بہا ہیں یہ موتی ترے خزانے کے
کفن ہو صاف و معطر بدن ہو شستہ و پاک
تکلفات ہیں یہ خاک میں ملانے کے
قضا کے ساتھ ہی آئے ہو میری بالیں پر
تم انتظار میں تھے کیا اسی بہانے کے
جوابِ خط میں لکیریں سی کھینچ کر احسن
بنا رہے ہیں وہ نقشے مرے مٹانے کے

(۶۱)

سامنے وہ ذرا نہیں ہوتا
جلوہ حیرت فزا نہیں ہوتا
دل رُبا ہے اشارۂ مژگاں
کبھی ناوک خطا نہیں ہوتا
کیا بھنور سے بچائے گا ملاح
ناخدا کچھ خدا نہیں ہوتا
چھا گیا رعبِ حسن قاصد پر
حرفِ مطلب ادا نہیں ہوتا
نہ کہے کوئی کچھ یہ بات ہے اور
ورنہ کس دل میں کیا نہیں ہوتا
شیخ کے سب مرید ہوتے ہیں
احسنِ بے ریا نہیں ہوتا

(۶۲)

عرضِ مطلب پر مجھے وہ اور دیں گے کیا جواب
ایک خاموشی ہے اُنکی لاکھ باتوں کا جواب
شکوہ ہائے جور سن کر مجھ سے کہتے اور کیا
وہ بگڑ بیٹھے جب اُن سے کچھ نہ بن آیا جواب
خوبیاں کیا کیا ہیں تجھ میں ہو نہیں سکتیں رقم
بے نظیر انداز ہیں تیرے تو باتیں لاجواب
سُن کے عرضِ مدعا وہ چپ ہوئے میں خوش ہوا
کیونکہ خاموشی رضا مندی کا ہے آدھا جواب
آ رہا ہے آج احسن نامہ بر ہنستا ہوا
ہو نہ ہو، لایا ہے خط کا کچھ نہ کچھ اچھا جواب

(۶۳)

اے دل نہ سُن افسانہ کسی شوخ حسیں کا
ناعاقبت اندیش رہے گا نہ کہیں کا

دُنیا کے حسینوں پہ نظر ہی نہیں اُٹھتی
رکھا نہ محبت نے تری مجکو کہیں کا

گو قدر وہاں خاک بھی ہوتی نہیں میری
ہر وقت تصور ہی مگر دل میں وہیں کا

ہر عاشقِ جاں باز کو ڈر اے ستم آرا
تلوار سے بڑھ کر ہی تری چینِ جبیں کا

ایسوں کو ستانا نہیں اچھا نہیں اچھا
اے چرخ نہ لے صبر کسی گوشہ نشیں کا

کچھ سختیٔ دُنیا کا مجھے غم نہیں احسنؔ
کھٹکا ہے مگر دل کو دمِ بازپسیں کا

(۶۴)

الزام کے قابل نہیں ناصح یہ کوئی بات
ہے عشق بُرا کام، نہ ہے چاہ بُری بات

کوشش یہ عبث ہے کہ نہ ہو فاش کوئی بات
یہ بات تھی منظور تو کیوں آپ نے کی بات

غم عیش ہی، شر خیر ہی، دُکھ سُکھ ہی بدل جائے
ہو تیری عنایت تو نہیں کوئی بڑی بات

مطلب ہو تو باتیں بھی خوشامد بھی کرم بھی
جب کچھ نہیں مطلب نہیں کرنا وہ کوئی بات

تعریف سے نکلا، نہ خوشامد سے بھلا کام
اس شوخ کے آگے نہ کوئی پیش چلی بات

کیا ذکر شبِ وصل سے شرمائیں کہ مخفیں ہم
جانے دو کہ اب کیا ہو گئی رات گئی بات

کیا طعنۂ اغیار سُنے جائیں گے احسنؔ
جب گُلبدنوں تک کی اُٹھائی نہ کڑی بات

(۶۵)

سُنا جو اُس نے مرا حالِ غم خوشی کی طرح
دلِ فسردہ مرا کھِل گیا کلی کی طرح

جفائے چرخ کی تنہا کروں شکایت کیا
تمھارے جور و ستم بھی تو ہیں اُسی کی طرح

تری نگاہ میں قاتل غضب کی ہے تیزی — اُتر گئی جگر و قلب تک چھری کی طرح
مرض تو کچھ نہیں لاحق تمہارے درباں کو — ملا رہا ہی مجھے تم سے اجنبی کی طرح
لُبھا لیا ہے تری وضع نے دل احسن کا
پسند آ نہیں سکتی اُسے کسی کی طرح

(۶۶)

تجھ سا کوئی مجموعۂ شوخی نہ ہوا شوخ — خود شوخ نظر، شوخ بیاں شوخ ادا شوخ
دل تھام رہے پہلو میں جسے لے ہی چکا شوخ — اب اس کے سوا اللہ نظر ہے تجھے کیا شوخ
جو آنکھ ملاتے نہیں لیتے ہیں وہی دل — چھپتے ہیں جو پردے میں وہ ہوتے ہیں سوا شوخ
تم منھ نہ چھپاؤ تو نہ چھیڑے کوئی تم کو — دنیا کو بناتی ہے یہی شرم و حیا شوخ
احسن تو ترا دیکھنے والا ہے پرانا
جھینپا ہوا بیٹھا ہے عبث آنکھ ملا شوخ

(۶۷)

گھر یاد، وطن یاد، نہ ہے کوئی پتا یاد — جس دن سے تجھے یاد کیا کچھ نہ رہا یاد
اُس شوخ ستم گر کی ظرافت کوئی دیکھے — آنا تو گیا بھول، مگر عذر رہا یاد
تم جیسے جفا پیشہ نہ پوچھیں تو نہ پوچھیں — تا حشر کریں گے مجھے سب اہلِ وفا یاد
کیا اُن سے کہوں کچھ کہ وہ کہدیتے ہیں سُنکر — مجکو نہیں اک حرف بھی مطلب کے سوا یاد
وعدے کے سوا اور وہ بھولے ہوئے کیا ہیں — شر یاد، دغا یاد، ستم یاد، جفا یاد
بھولا ہوا ہے تیرے کرم پر ترا احسن
رکھنا اُسے یا شافعِ دیں روزِ جزا یاد

(۶۸)

خواہش ہو اُن سے کوئی نہ کچھ آرزو مجھے — کرنی ہو ایک بات مگر دو بدو مجھے

اُس کے لئے کہ جس کی رہی جستجو مجھے
گھر گھر لئے پھری ہے مری آرزو مجھے

اے تاجدارِ حسن ترے ذکر کے سوا
آتی نہیں پسند کوئی گفتگو مجھے

آخر بشر ہوں میں بھی کہاں تک کروں گا صبر
اِتنا ستا نہ اے فلکِ کینہ جو مجھے

تصویر کی طرح متحیر بنا گیا
آیا نظر جہاں کہیں آئینہ رو مجھے

احسنؔ خلافِ عقل ہو کس طرح مان لوں
ممکن نہیں کہ دوست سمجھ لے عدو مجھے

(۶۹)

یہ تم نے کر دیا ہے سحر کیا سارے زمانے پر
پڑی رہتی ہے اک دنیا تمہارے آستانے پر

نگاہِ ناز جب اُٹھی ہوا زخمی دلِ مضطر
یہ تیر ایسا نہیں چلے کہ نہ بیٹھے جو نشانے پر

مزا آتا نہیں دنیا کو تذکرِ محبت میں
چڑھا دو حاشیے دو اک نہ جب تک اس فسانے پر

گل و بلبل کا دشمن کون ہو صیاد یا گلچیں
نظر پھولوں پہ اُس کی ہو تو اسکی آشیانے پر

لڑکپن کا وہ بھولا پن تمہارا اب کہاں باقی
جواں ہو کر نکالے ہیں عجب ناز و ادا نے پر

کبھی دھوکا نہ کھانا احسنؔ ان تسبیح والوں سے
کہ یہ ایمان فروشی کرتے ہیں ایک ایک دانے پر

(۷۰)

گلہ چرخ غلط شکوۂ اغیار عبث
کہ محبت تو ہے بے لذتِ آزار عبث

جھوٹے وعدوں سے تسلی کہیں ہو سکتی ہے
دل دہی کے لئے کرتے ہو تم اقرار عبث

اس رکاوٹ سے کہیں جوشِ جنوں رکتا ہے
بن رہے ہیں مرے گھر میں در و دیوار عبث

دل سے مجبور ہوں میں ورنہ سمجھتا ہوں یہ خوب
میرا جانا ہے سوئے کوچۂ دلدار عبث

نہ وہ آئیں ہیں نہ آئیں گے نہ آ سکتے ہیں
ہے اس اُمید پہ جینا دلِ بیمار عبث

ٹھوکریں کھا کے سنبھلتا ہے زمانہ احسنؔ
عشق میں ڈھونڈھتے ہو تم رہِ ہموار عبث

(۷۱)

نئے انداز سے افسانۂ دردِ نہاں کہیے
نہ ہوں الفاظ جس میں اُس زباں میں داستاں کہیے

دو روزہ ہو موسمِ گل کو نہ ہرگز جاوداں کہیے
سمجھتی ہے جسے دُنیا بہار اس کو خزاں کہیے

ترے ناز و ادا کی اور کیا نیرنگیاں کہیے
انھیں کو جانیے جاں بخش انھیں کو جانستاں کہیے

وہ خود بیں خود آرا آپ ہی اپنا نگہباں ہے
جسے محفل نشیں کہیے اُسی کو پاسباں کہیے

یہ ذکرِ غیر بے وقت، محل کی قید کیا ہمیں
سناؤں داستانِ عشق جب کہیے جہاں کہیے

خدا دیر آشنا ہے اور بُتِ نا آشنا احسنؔ
ہمیں جلدی ہے آخر مدعائے دل کہاں کہیے

(۷۲)

خنجر مچل کے کیوں کفِ قاتل میں رہ گیا
کچھ دم تھا وہ بھی جو تنِ بسمل میں رہ گیا

دعویٰ سب آئینہ کے مقابل میں رہ گیا
اپنا سا موں لیے تری محفل میں رہ گیا

وعدہ کیا کسی سے کسی کو دیا جواب
میں موں ہی دیکھتا تری محفل میں رہ گیا

ہاں ہاں ضرور ذکر وہ تھا اس نحیف کا
جو آتے آتے غیر کی محفل میں رہ گیا

بس طعنہ ہائے غیر نے بے طرح چٹکیاں
ہر لفظ تیر بن کے مرے دل میں رہ گیا

دُنیا میں ہائے احسنِ مرحوم اب کہاں
ہاں اُس کا نام کوچۂ قاتل میں رہ گیا

(۷۳)

نہ کیا کیا، اُنھوں نے کیا نہ ہوا
مگر اک ہم سے جو کہا، نہ ہوا

دل شکن ہے تری دل افزائی
وعدہ اکثر ہوا وفا نہ ہوا

کون اب تیرے در پہ جھانکے گا
میں ہی جب قسمت آزما نہ ہوا

دل عبث زندگی پہ مرتا ہے — آج ہے کل ہوا، ہوا نہ ہوا
ضبط نے لاکھ دل پہ جبر کیا — لیکن اخفائے مدعا نہ ہوا
چھوڑتا ہوں ترے رسوا سب کو — اب نہ کہنا کہ تو مرا نہ ہوا
ہائے نیرنگیاں زمانے کی — دن میں انداز رات کا نہ ہوا
سچ کہا ہے غرض کی دنیا ہے — کوئی بے مطلب آشنا نہ ہوا

اب تو بدنام ہو چکا احسن
اب بھی کیا آپ کا بھلا نہ ہوا

(۷۴)

مانا کہ بے وفا ہو، سراپا غرور ہو — پھر بھی یہ ہے کہ پیار کے قابل ضرور ہو
اس طرح مے کشی ہو تو کیا خوف محتسب — ساغر پہ ہاتھ، لب پہ رہے یا غفور ہو
بے فیض کوئی یوسفِ ثانی بھی ہو تو کیا — وعدہ اگر کرو تو وفا بھی ضرور ہو
ہوتی ہیں ایک وعدہ سے کیا کیا تسلیاں — یہ اُس سے پوچھیے جو کوئی ناصبور ہو

رندانِ بے ریا کو ہو احسن کہاں فلاح
دنیا ہو اور حضرتِ واعظ کا زور ہو

(۷۵)

دو بھر ہیں بے تمہارے دو دن بھی زندگی کے — بس تم رہو سلامت ہم کیا کریں گے جی کے
پھر گالیاں سُنا کر اے شوخ مسکرانا — قربان تیرے موں کے صدقے تری ہنسی کے
نا آشنائے حسرت دُنیا میں اک ہمیں ہیں — ہونا ہے ورنہ کیا کچھ دل ہیچ آدمی کے
قاصد کو بھی غرض کیا اگالی جو ہم کو دیتا — ہے چھیڑ یہ اُسی کی فقرے ہیں یہ اُسی کے
اے قسمتِ مخالف یہ انقلاب کیسا؟ — غم کھا رہا ہے اُن کو بھوکے جو تھے خوشی کے
ہو وصل یا جُدائی، ہو میل یا لڑائی — احسن یہ سارے جھگڑے ہوتے ہیں جیتے جی کے

(۷۶)

قتل کیوں کرتے نہیں سامان سب تیار ہے — ہم ہیں اور شوقِ شہادت، تم ہو اور تلوار ہے
دیکھ کر اک چشمِ مستِ ناز دل سرشار ہے — واہ کیا میخانہ ہے، کیا مے ہے، کیا خمار ہے
مدعی ہو، پاسباں ہو، آسماں ہو، کوئی ہو — جو تمہارا یار ہے، میرے سوا اغیار ہے
کل وہ ہمت تھی کہ ہر دشوار کام آسان تھا — آج یہ گت ہے کہ ہر آسان بھی دشوار ہے

احسن اطمینانِ خاطر اب مقدر میں کہاں
کیوں پریشانی نہ ہو برہم مزاجِ یار ہے

(۷۷)

زمانے میں پڑی ہلچل، دلوں میں اضطراب آیا — غضب کی چٹکیاں لیتا ہوا تیرا شباب آیا
کسی کو بھیج کر خط، مجھ پہ یہ کیسا عذاب آیا — کہ ہر اک پوچھتا ہے نامہ بر آیا، جواب آیا
ہماری آبرو کے ضبط پہ پھر جائے گا پانی — زمیں تک ایک قطرہ بھی جو اے چشمِ پُر آب آیا
بنا ہر طالبِ دیدار اک تصویر حیرت کی — سرِ محفل جو اٹھلاتا ہوا وہ بے نقاب آیا
وہ ہو دیر آشنا ایسا کہ قاصد اس سے خط لیکر — قیامت تک بھی آ جائے تو ہم جانیں شتاب آیا
دعا دے کر سزا پاتا ہوں کیا الٹا زمانہ ہے — خوشامد بھی جو کی میں نے تو ظالم کو عتاب آیا

لڑی ہے آنکھ جب سے پڑ گئے ہیں جان کے لالے
تمہارا دل نہیں آیا ہے احسن اک عذاب آیا

(۷۸)

کہتے ہیں آج ہیں ہم اور کہیں جانے کو — ہائے کیا ہی ہے یہ چٹکی مرے تڑپانے کو
کتنا پھرتا ہے مہِ نو کو گریباں سے مرا — رٹ لگی ہے یہ نئی آپ کے دیوانے کو
توبہ کے بعد بھی جاتا نہیں دل سے وہ خیال — خواب میں دیکھ لیا کرتے ہیں میخانے کو

اپنی باتوں سے نہ باز آئے گا ناصح نہ سہی ہم بھی اب سمجھیں گے آئے تو وہ سمجھانے کو
قیس و لیلیٰ کا زمانہ تو ہے دقیانوسی تم سنو اپنے مرے حال کے افسانے کو

باش درویش صفت دار کلاہِ تبری
مگر احسنؔ نہ پہن مکر بھرے بانے کو

(۷۹)

ناراض ہو نہ گریۂ بے اختیار پر قابو نہیں ہے مجکو دلِ بے قرار پر
میں اس پہ جبر کر کے چھڑا تا بتوں کی یاد چلتا جو زور کچھ دلِ بے اختیار پر
شغلِ شراب، سیرِ چمن، خدمتِ جنوں یہ سارے کام بند ہیں فصلِ بہار پر
یہ شوق اضطراب نما میرا دیکھیے ان سے جواب خط کا منگایا ہے تار پر
جب ان کے پٹنے والوں کا ہوتا ہے تذکرہ پڑتی ہے سب کی آنکھ اسی خاکسار پر
حالانکہ جانتے ہیں کہ رہنا نہیں یہاں مرتے ہیں پھر بھی ہستیِ ناپائیدار پر

غافل گناہ سے ہے جو احسنؔ تو کیا ہوا
اس کی نظر ہے رحمتِ پروردگار پر

(۸۰)

وہ عشقِ دل نواز غم افزا کہیں جسے ایسا ہے اک مرض کہ دوا کہیں جسے
اے جذبِ شوق یاد دلا عہدِ التفات لیکن نہ اس طرح کہ تقاضا کہیں جسے
اس چشمِ شرمگیں و فسوں ساز کے سوا ہے کون وہ مریض مسیحا کہیں جسے
یک رنگیٔ مزاج کو نیرنگِ عشق نے ایسا بنا دیا کہ تماشا کہیں جسے
فرصت کسی کو ہو تو کسی دن سنائیں ہم اک حرفِ دل کہ جانِ تمنا کہیں جسے
دیوانہ ہوں، مگر ہوں قناعت پسند بھی وہ گوشہ چاہتا ہوں کہ صحرا کہیں جسے
احسنؔ ہی ایک بد نہیں ضد سے مزاج کی سمجھیں بُرا وہ اسکو سب اچھا کہیں جسے

(۸۱)

روک لے اے ضبط جو آنسو کہ چشمِ تر میں ہے ۔ کچھ نہیں بگڑا ہی ابتک گھر کی دولت گھر میں ہے
غم کو پالا ہو تو خونِ دل پلائیں کیوں نہ ہم ۔ اسمیں کیا حجت کرے کوئی جو حاضر گھر میں ہے
دب گیا تھا میرے مرنے سے جو اے محشر خرام ۔ کیا وہی خوابیدہ فتنہ صورتِ محشر میں ہے
تیرے وعدوں کے تلوّن نے تری کھودی ہو ساکھ ۔ کیا بھروسہ ہو کہ دم بھر میں نہیں دم بھر میں ہے
جوشِ غم سے ہے یہ عالم چشمِ دریا بار کا ۔ رات دن بے فصل کی برسات میرے گھر میں ہے
مانتا ہے آستاں کو تیرے کعبہ اور کون ۔ یہ ہمارا ہی نشانِ سجدہ سنگِ در میں ہے

احسنؔ آوارہ قسمت کی نہ پوچھو گردشیں
اپنے گھر بیٹھا ہوا تقدیر کے چکر میں ہے

(۸۲)

ساقیِ وواعظ میں ضد ہی بادہ کش چکر میں ہی ۔ توبہ لب پر اور لب ڈوبا ہوا ساغر میں ہی
کون ایسا ہو یہ کس کی خود دلِ مضطر میں ہی ۔ چین سے دنیا ہو یہ بے چین اپنے گھر میں ہی
ہم کو اپنی سخت جانی پر بھروسا کچھ نہیں ۔ تو بتا سفاک، دم کتنا ترے خنجر میں ہی
اپنے دیوانوں سے پوچھیں آپ حسنِ سادگی ۔ ہو بناوٹ ہی بناوٹ اور کیا زیور میں ہی
سب کھٹکتے ہیں صفِ مژگاں سے تیری چشمِ یار ۔ اک نہ اک دل چھیدنے والا اسی لشکر میں ہی

ناز ہے اتنا تراؔ احسن کہ دھوکے میں ہیں سب
یہ کوئی بیمارِ غم ہے یا سخن بستر میں ہی

(۸۳)

اور کیا محبت میں حالِ زار ہستی ہے ۔ سر و بالِ گردن ہے جان بارِ ہستی ہے
آسمان اُسے چاہیے آپ اس کو ٹھکرائیں ۔ پائمال حسرت آئی خاکسار ہستی ہے
دل اِدھر ہو پس مردہ جاں اُدھر ہو افسردہ ۔ کس کو ان حوادث پر اعتبار ہستی ہے

زندہ رکھ کے عاشق کو چاہتا ہے دکھ دینا
جان کا جو دشمن ہے دوستدارِ ہستی ہے

سینکڑوں تمنائیں دم بہ دم کھٹکتی ہیں
دل نہیں ہے پہلو میں خارزارِ ہستی ہے

کچھ سکون حاصل ہو زندگی میں ناممکن
ہر نفس سے وابستہ انتشارِ ہستی ہے

غنچہ مسکراتے ہی پھول بن کے مرجھایا
یہ فضائے گلشن ہے یہ بہارِ ہستی ہے

سب نمائش وقتی سب حقیقتِ فرضی
جس قدر زمانے میں کاروبارِ ہستی ہے

کوئی کیا ہنسے احسن جب کہ دہرِ فانی میں
سرخوشِ مسرت بھی سوگوارِ ہستی ہے

(۸۴)

وہ بات ہے دیکھو مری وحشت کے اثر میں
تم چین سے اب بیٹھ نہیں سکتے ہو گھر میں

کچھ فرق نہیں دیکھنے والوں کی نظر میں
بت خانے میں جو ہے وہی اللہ کے گھر میں

اک آگ سی لگ جاتی ہے دل اور جگر میں
کیا قوتِ برقی ہے محبت کے اثر میں

پھرتا ہوں زمانے میں تصور کے سہارے
کرتا ہوں سفر میں یوں ہی بیٹھا ہوا گھر میں

ہو سکتی تھی کیا اور کوئی شکل تباہی
دریا میں بھنور ہے مری کشتی ہے بھنور میں

کچھ سوچ سمجھ کر بھی کہا کیجیے ناصح
مانا کہ ہے سینگوں کی کسر آپ کے سر میں

کیا جانیے، کیا بعدِ فنا حال ہو احسن
گھلتی ہے مری جان اسی خوف و خطر میں

(۸۵)

دل کس شمار میں ہے، جگر کس قطار میں
دونوں کا فیصلہ ہے وہاں ایک وار میں

رکھتا نہیں قدم کہ ہوا نے اڑا دیا
کیا نقشِ پائے غیر جمے کوئے یار میں

باقی ہیں بعدِ مرگ بھی آثار ضعف کے
اڑنے کی بھی سکت نہیں میرے غبار میں

جب ہم نے داغ کھائے تھے اب باغ باغ ہیں
جو تھا خزاں میں رنگ وہی ہے بہار میں

نرگس کی آنکھ سرو کا قد غنچہ کا دہن — یہ حسن کا چمن ہے اسی گلعذار میں
ظالم کہا جو میں نے تمھیں کیوں خفا ہوئے — اکثر نکل ہی جاتی ہے یہ بات پیار میں
یا مجکو صبر یا اُسے توفیقِ رحم دے — اللہ کیا نہیں ہے ترے اختیار میں

ممکن نہیں کہ دن نہ پھریں احسن آپ کے
کب تک رہیں گی گردشیں لیل و نہار میں

(۸۶)

دل ہے واقف میرے ہر اک راز سے — کام چلتا ہے اسی دم ساز سے
مُردہ دل زندہ ہوں جب آواز سے — کم نہیں تیرا سخن اعجاز سے
دل میں رکھتا تھا چھپا کر رازِ عشق — کھل گیا سب دیدۂ غمّاز سے
پیاس میں ساقی کہاں کی ناپ تول — ڈال ہی دے جام میں انداز سے

آج احسن بلبلِ ہندوستاں
کم نہیں ہے بلبلِ شیراز سے

(۸۷)

فلک چکرا رہا ہے نالۂ دل کی رسائی سے — بہت کچھ چڑھ بنی ہے اپنی اس تیر ہوائی سے
کہاں تک کوئی ہمدردی کرے دردِ جدائی سے — الٰہی باز آئے ہم تو ایسی آشنائی سے
جنابِ خضر یوں چھپتے نہ پھرتے اک خدائی سے — اگر واقف ذرا ہوتے طریقِ رہنمائی سے
نزاکت کی رقابت ہاتھ تک چھونے نہیں دیتی — وہ آ پہنچی وہ آ لپٹی تری نازک کلائی سے
کیا رسوائیوں نے عشق کی مشہور دنیا میں — اُچھالا نام اپنا ہم نے اپنی جگ ہنسائی سے
ذرا بھی تیوری پر اپنی بل آنے نہیں دیتا — گلہ سنتا ہے اپنا کینہ جو کیسی صفائی سے

اب اس سے بات کرنے کی توقع کیا کرے کوئی
لیا جس نے سلام احسن بڑی بے اعتنائی سے

(۸۸)

بزمِ دشمن میں وہ ہیں ان میں ہمارا دل ہے — ہائے لیلیٰ ہے کہیں اور کہیں محمل ہے
کیجیے جس کا تصور وہی آتا ہے نظر — میرے سینے میں یہ دل ہے کہ بھری محفل ہے
جس قدر آپ کے وعدے ہیں وہ سب سچے ہیں — اور جو میری شکایت ہے وہ سب باطل ہے
غیر کے باب میں کیا آپ سے تکرار کروں — نہ کوئی اس کا نتیجہ ہے نہ کچھ حاصل ہے
آدمی دستِ قضا سے نہ بچا ہے نہ بچے — بچ گیا آج اگر کوئی تو کل مشکل ہے

ناخوشیِ طبع کی ظاہر ہے غزل سے احسنؔ
مگر اندیشۂ آزردگیِ سائل ہے

(۸۹)

جلوہ اُن کا عام کیوں ہوتا زمانے کے لئے — حسن کی دولت نہیں ہوتی مٹانے کے لئے
یہ نہیں سمجھے تھے ہم روتے رہیں گے عمر بھر — دل لگایا تھا فقط ہنسنے ہنسانے کے لئے
زندگی میں موت سے غافل نہ ہونا چاہیے — اُس زمانے کو نہ بھولو اِس زمانے کے لئے
جب کسی نے اُن کی محفل میں نہ پوچھی میری بات — دردِ دل اُٹھا یہ مجبوری اُٹھانے کے لئے

ہو مبارک احسنؔ اب نو واردوں کو بزمِ یار
دوستدارانِ کہن اُٹھتے ہیں جانے کے لئے

(۹۰)

تعلق آستانِ یار سے چھوڑا نہیں جاتا — چلا جاتا ہوں میں لیکن دلِ شیدا نہیں جاتا
یہ محویت ہے دل کی یا تری محفل کی دلچسپی — یہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں تو پھر اُٹھا نہیں جاتا
شکستِ عہد پر آمادہ وہ ہر وقت رہتے ہیں — مگر ٹوٹے ہوئے دل کو کہیں جوڑا نہیں جاتا

جب آیا ان کا پیکاں لے گیا تاب تواں لیکن — یہ نہاں میزباں کے پاس سے تنہا نہیں جاتا

ترے جلوہ کو ہم اے جلوہ گر سمجھیں کیوں پردہ
دکھایا جا رہا ہے وہ مگر دیکھا نہیں جاتا

(۹۱)

دل جھکا مائل طبیعت ہو گئی — آج بسم اللہ اُلفت ہو گئی
دے دیا دل جس کو ہم نے دے دیا — ہو گئی جس سے محبت ہو گئی
دل میں جبتک آہ تھی اک بات تھی — لب تک آنے ہی شکایت ہو گئی
میرا حالِ زار تو دیکھا مگر — یہ نہ پوچھا کیوں یہ حالت ہو گئی

کہہ گئے احسن کے منہ پر آج وہ
تیری صورت سے بھی نفرت ہو گئی

(۹۲)

میرا تمہارا دُنیا افسانہ کہہ رہی ہے — کیا کیا نہ کہہ چکی ہے، کیا کیا نہ کہہ رہی ہے
آغاز سوزِ اُلفت تھا شمع کی زباں پر — انجام عشق خاکِ پروانہ کہہ رہی ہے
ہو ذکرِ غم کسی کا میں یہ سمجھ رہا ہوں — دُنیا مجھی سے میرا افسانہ کہہ رہی ہے
دل دیکھے جانے والو جاتے کہاں ہو ٹھہرو — کچھ اور بھی نگاہِ جانانہ کہہ رہی ہے
دُنیا کی لغو گوئی اے عشق تو نے دیکھی — آبادیوں کو تیری ویرانہ کہہ رہی ہے

ہوں جنتِ نظر بھی فردوس زندگی بھی
دُنیا سے تیری شانِ کاشانہ کہہ رہی ہے

(۹۳)

اشاروں میں جو اک طرزِ بیاں معلوم ہوتی ہے — تری چشمِ سخن گو کی زباں معلوم ہوتی ہے
چمکتی ہے بہت دور آشیاں سے برقِ سوزندہ — مگر مجکو قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

ساقی ہے یہی دُنیا، بناتی ہے یہی عقبیٰ ۔ محبت کارسازِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے
مزے لے لے کے ذکرِ حور و غلماں شیخ کرتے ہیں ۔ طبیعت پیرِ دو مرشد کی جواں معلوم ہوتی ہے
پیام آیا، نہ خط آیا، نہ وہ آئے نہ موت آئی ۔ مری سعیِ طلب سب رائیگاں معلوم ہوتی ہے

جہانِ بے ثبات اک مستقل غم خانہ ہے احسن
یہاں آوازِ نغمہ بھی نغاں معلوم ہوتی ہے

(۹۴)

وہاں یہ حضرتِ دل بے بلائے جاتے ہیں ۔ جہاں بلائے ہوئے بھی اُٹھائے جاتے ہیں
ٹھہر ٹھہر کے چل او جلد باز عمرِ رواں ۔ رہِ وادی میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

نمودِ حشر نمائش ہے بھولے بھٹکوں کی
تمام عمر کے بچھڑے ملائے جاتے ہیں

(۹۵)

کھلے ہوئے یہی معنی ہیں مسکرانے کے ۔ ہنسی ہنسی میں ارادے ہیں دل اُڑانے کے
جدھر نگاہ اُٹھائی اُدھر اُسے دیکھا ۔ کہاں نہیں ہیں ٹھکانے مرے یگانے کے
قضا کے ساتھ ہی آئے ہو میری بالیں پر ۔ تم انتظار میں تھے کیا اسی بہانے کے
خُمِ شکستہ کے ٹکڑے اُٹھائے رندوں نے ۔ تبرکات سمجھ کر شراب خانے کے
یہ بے کسی کا ہے عالم کہ ہو رہا ہے گماں ۔ نہ ہے زمانہ ہمارا نہ ہم زمانے کے
کفن ہو صاف و معطر بدن ہو شستہ و پاک ۔ تکلفات یہ ہیں خاک میں ملانے کے
وقارِ ضبط نہ کھو چشمِ تر نہ اشک بہا ۔ کہ بے بہا ہیں یہ موتی ترے خزانے کے
کہاں کہاں نہ گئے تم کہاں کہاں نہ رہے ۔ کھلے نصیب نہ میرے غریب خانے کے

جوابِ خط میں لکیریں سی کھینچ کر احسن
بنا رہے ہیں وہ نقشے مرے مٹانے کے

(۹۶)

ہو کے عاشق کیا بتاؤں کیا کیا
عمر بھر تقدیر کو رویا کیا

کوئی کرتا کیوں کر اس پر اعتراض
تھا وہ خود مختار جو چاہا کیا

کر گئے دنیا میں سب کچھ اہلِ کار
میں نکمّا وقت ہی کھویا کیا

جی اُٹھا دیکھی جو شرما گئیں وہ آنکھ
مجھکو اک بیمار نے اچھا کیا

اور کیا کرتا دلِ مجروحِ ناز
جس قدر تڑپا گیا تڑپا کیا

باعثِ بدنامیِ احسن نہ پوچھ
نیک نامی نے اُسے رسوا کیا

(۹۷)

بات کرتا کوئی کیا لب بھی ہلایا نہ گیا
آپ کو دیکھ کے آپ میں آیا نہ گیا

کیوں نہ حیرت ہو مجھے گم شدگی پر دل کی
کہ وہ غائب تو ہے لیکن کہیں آیا نہ گیا

دُھن ہے بیمارِ محبت کو اُسی کی دن رات
جس نے پوچھا نہ گچھا جو کبھی آیا نہ گیا

ہم ترے کوچے میں برداشتہ خاطر تو رہے
تیری اُلفت سے مگر ہاتھ اُٹھایا نہ گیا

بات اس طور سے بگڑی کہ بنائے نہ بنی
کوئی اس شان سے روٹھا کہ منایا نہ گیا

جیتے جی ہوتی ہے آنکھوں کی مُروّت سب کو
ساتھ مُردے کے کوئی اپنا پرایا نہ گیا

ایسی تصویر کی تقدیر پہ کیوں رشک نہ ہو
وہ منگائی گئی احسن کو بُلایا نہ گیا

(۹۸)

چاہا جو ہم نے روزِ ازل وہ تو کیا ملا
اُلٹی سزا ملی کہ دلِ ناسزا ملا

محفل ملی، رقیب ملے، نقشِ پا ملا
سب کچھ ملا، مگر نہ تمہارا پتا ملا

دُنیا سے بچ کے دین کو حاصل نہ کر سکے ۔۔۔ پہلے بُتوں کا ساتھ رہا پھر خُدا مِلا
دل مِل گئے تو شرم و تکلّف فضول ہے ۔۔۔ منہ کھول، سر اُٹھا، نگہِ آشنا مِلا
پوچھا مزاج اُن کا تو ناراض ہو گئے ۔۔۔ اچھا کیا تھا کام نتیجہ بُرا مِلا
پوچھا حُدودِ عشق کو جس رہ نورد سے ۔۔۔ آگے بڑھو، جواب یہ چلتا ہوا مِلا
واعظ! صنم کدہ بھی ہو اک دیکھنے کی چیز ۔۔۔ آنکھیں بُتوں سے بھی کبھی مردِ خدا مِلا

احسنؔ کا دل اگر نہیں اچھا نہ ہو مگر
وہ سفت مِل گیا جو تمہیں کیا بُرا مِلا

(۹۹)

دُنیائے عیش و غم کا سادی حساب ہے ۔۔۔ تصویرِ خواب وہ ہے یہ تعبیرِ خواب ہے
پوچھو نہ مجھ سے کیوں تری حالت خراب ہے ۔۔۔ سوچو! تمہارے پاس ہی اسکا جواب ہے
برباد ہیں، تباہ ہیں، آشفتہ حال ہیں ۔۔۔ تم پر مِٹے ہوؤں کی یہ مٹّی خراب ہے
دُنیا ہے اک نمائشِ خوابِ آفریں مگر ۔۔۔ جو دیکھتے ہیں جاگتے ہیں وہ یہ خواب ہے

احسنؔ کے دل کو خوب چُنا اپنے واسطے
یہ حُسنِ انتخاب نرالا جواب ہے

(۱۰۰)

دل میں رہ کر مجھے دیوانہ بنایا ہوتا ۔۔۔ تم نے اس گھر کو پری خانہ بنایا ہوتا
مے کشوں میں کوئی تفریق نہ رکھتا ساقی ۔۔۔ ایک انداز کا پیمانہ بنایا ہوتا
اپنے دیوانے کی تم سیرِ جنوں خود کرتے ۔۔۔ اُس کو دُنیا کا تماشہ نہ بنایا ہوتا
شکوۂ جور کیا اُن سے تو ارشاد ہوا ۔۔۔ دوست کیوں مجکو بنایا نہ بنایا ہوتا
دل نے اک بُت کیلئے حق سے بگاڑی ناحق ۔۔۔ اس یگانے کو نہ بیگانہ بنایا ہوتا
مِل لئے غیر سے اچھا ہوا احسنؔ ورنہ ۔۔۔ اس نے بے بات کا افسانہ بنایا ہوتا

(۱۰۱)

جب تک ہمارے ساتھ دلِ بیقرار تھا
حاصل سکون زندگیِ مستعار تھا

جو تیر بے چلے ہوئے سینے کے پار تھا
وہ اک کرشمۂ نگہ شرمسار تھا

اچھا ہے زندگی کے بکھیڑے تمام ہوں
خواب آ گئی اے اجل کہ ترا انتظار تھا

خود اعتمادِ عشق کا اللہ رے حسنِ ظن
وہ جھوٹ بولتے تھے مجھے اعتبار تھا

دامن جھٹک جھٹک کے اُڑاتے رہے جسے
وہ اُن کے پائمالِ ستم کا غُبار تھا

جب آپ لے کے آ گئے سرمایۂ سکوں
پھر جان مضطرب تھی نہ دل بیقرار تھا

مایوسیوں سے جس کو ہوئیں راحتیں نصیب
وہ نامراد آپ کا اُمیدوار تھا

سینے میں کیوں خدنگِ نظر دل کو چھوڑتا
ساری شکارگہ میں وہی اک شکار تھا

احسن جو رہ کے نیک بھی بدنام ہی رہا
یہ اک کرم نما ستم روزگار تھا

(۱۰۲)

سُنائیں اور کیا ہم روئداد واقعی اپنی
حقیقت کچھ نہیں اپنی حقیقت ہے یہی اپنی

جو تو اپنا نہیں تو خاک چاہوں زندگی اپنی
تامل کیا ہے قاتل پھیر دے مجھ پر چھری اپنی

تمہارا حُسنِ سادہ جلوۂ رنگیں سے بہتر تھا
چمن میں جا کے تم نے کیوں مٹا دی سادگی اپنی

فرشتے اُس کے در پر آج بھی سجدے کیا کرتے
اگر دنیا میں رہ کر قدر کرتا آدمی اپنی

تصور سامنے ہر دم، تخیل مونس و ہمدم
کبھی تنہا نظر آئی نہ ہم کو بے کسی اپنی

نہ ٹھہری اور بہتی ہوئی عمرِ رواں چل دی
قضا کے ساتھ مجھکو کاٹنی ہے زندگی اپنی

خیالِ حسن غارت گر سے احسن کچھ نہ پاؤ گے
اکارت کر رہے ہو مفت میں کیوں زندگی اپنی

(۱۰۳)

نہ چمن سے واسطہ ہو نہ غرض ہو آشیاں سے
ہوئی قید میں رہائی غم و فکرِ دو جہاں سے

مرے سوزِ دل کو پوچھو تپشِ غمِ نہاں سے
یہ وہ داستاں نہیں ہے جو بیاں کروں زباں سے

تجھے سجدہ کرنے والے بہت اُٹھ گئے جہاں سے
نہ مٹا نشانِ سجدہ ترے سنگِ آستاں سے

نہ رہی نکوں کی دولت کہ بہ جبر چھین لی ہے
ترے تیرِ نیم کش نے مرے قلبِ نیم جاں سے

تری جب نگاہ اُٹھی تو وہ بے پناہ اُٹھی
کوئی دل بچا نہ ظالم ترے تیرِ بے کماں سے

سرِ پُر غرور اُٹھا کر نہ چلو خفیف ہو گے
جو اُٹھا ہے یوں زمیں سے وہ گرا ہے آسماں سے

تری خوش خرامیوں کے ترے نقشِ پا ہیں شاہد
کہ بیان کر رہے ہیں وہ دہانِ بے زباں سے

نہ جھکا نہ جھک سکے گا نہ دبا نہ دب سکے گا
ترے در کا رہنے والا کسی اور آستاں سے

وہ ہوس پرست دل ہے وہ بہت ہی پست دل ہے
جو زباں پہ نہ لائے کوئی بات خوفِ جاں سے

پسِ در صدائے دلکش مجھے کیا سنا رہے ہو
جو پڑا ہوا ہے پردہ وہ اُٹھاؤ درمیاں سے

مرا حالِ زار سنتا کوئی کس طرح سے احسن
نہ کہا گیا زباں سے نہ ادا ہوا زباں سے

(۱۰۴)

دامنوں کو باندھ لیتے کیوں گریبانوں کے پاس
عقل اگر ہوتی گرہ کی تیرے دیوانوں کے پاس

بے تکلف برہمن آئیں مسلمانوں کے پاس
مسجدیں تعمیر ہوتی ہیں صنم خانوں کے پاس

دب سکی پستی بلندی کی زبردستی سے کب
جھونپڑے اکثر نظر آتے ہیں ایوانوں کے پاس

اُٹھ گئے دُنیا سے بے چارے یہی حسرت لئے
تم کبھی آ کر نہ بیٹھے اپنے مہمانوں کے پاس

آجکل احسن دروغ و رشک و غیبت کے سوا
رہ گئی ہیں اور کیا باتیں سخن دانوں کے پاس

(۱۰۵)

بڑے نافہم ہیں وہ جو انھیں قاتل سمجھتے ہیں
ہم ان کی دل ستانی کو حیاتِ دل سمجھتے ہیں

مظالم ہی سہی وابستگی تو اُن سے قائم ہے
غنیمت ہے کہ وہ ہم کو کسی قابل سمجھتے ہیں

یہ رمز آگاہِ اُلفت ہیں خموشی ہی خموشی میں
بیانِ شوق سنتے ہیں زبانِ دل سمجھتے ہیں

خداوندانِ الفت کا بھی اُلٹا کارخانہ ہے
کہ خود دِل مانگتے ہیں اور ہمیں سائل سمجھتے ہیں

یہ مجبورِ محبت کے لئے بے اختیاری ہے
کہ اپنا دل بھی ہم احسن پرایا دل سمجھتے ہیں

(۱۰۶)

نہ صنم کدے میں یہ شاد ہو نہ حرم کی آب ہوا سے خوش
وہ ہی خود پسند یہ آدمی نہ بتوں سے خوش نہ خدا سے خوش

کبھی صلح ہو کبھی جنگ ہو کبھی سنگ ہو کبھی موم ہو
جو یہ ہر گھڑی نیا ڈھنگ ہو تو ہو کون ایسی ادا سے خوش

نہ کرم کرے نہ دعا کرے مری یاد اس کو رہا کرے
نہ کبھی کبھی یہ ہوا کرے تو ہو احسن ایسی جفا سے خوش

(۱۰۷)

آنکھ والا حسن کا مشتاق شیدا کیوں نہ ہو
دل ہو پہلو میں تو پھر دل میں تمنا کیوں نہ ہو

کچھ نہ کچھ میری دعاؤں کا نتیجہ کیوں نہ ہو
آپ جو چاہیں وہ ہو اور دل کا چاہا کیوں نہ ہو

مدعی سے میل، درباں کی خوشامد، دل ہو صبر
تیرے ملنے کے لئے سب کچھ گوارا کیوں نہ ہو

جس کو اپنی بزم میں تو بیٹھنے دیتا نہیں
ایسے بدقسمت کا چکر میں ستارا کیوں نہ ہو

بن کے دیوانہ حسینوں کا کھلونا بن گیا
کوئی مجھ کو دیکھ کر محوِ تماشا کیوں نہ ہو

بعد وصل احسن کریں کیا شکوہ رنجِ فراق
عیش جتنا ہو چکا ہے غم بھی اتنا کیوں نہ ہو

۱۰۸

جہانِ عشق میں جس دل کو اضطراب نہ تھا
وہ مطمئن بھی اگر تھا تو کامیاب نہ تھا

وہ بزمِ ناز میں ہرچند بے نقاب نہ تھا
اُٹھی نگاہِ تصوّر تو پھر حجاب نہ تھا

تغیّرات کی دُنیا بسائی ہے میں نے
مرے وجود سے پہلے کچھ انقلاب نہ تھا

اُٹھا کے سر لبِ دریا بچارہ بیٹھ گیا
کہ پیش خیمہ تباہی کا تھا حباب نہ تھا

مُسافرانِ عدم کیا پلٹ کے آسکتے
بڑا طویل سفر تھا وہ پاتراب نہ تھا

کسی کے جلوہ کی نیرنگیاں نمایاں تھیں
سحر کو مہر نہ تھا شب کو ماہتاب نہ تھا

وہ کس دلیل سے احسن کو مانتے عاشق
تباہ حال نہ تھا، خانماں خراب نہ تھا

مُتفرّق کلام

قطعہ۔ خمسہ۔ تضمین۔ نوحہ۔ سلام۔ مرثیہ
مثنوی۔ رُباعی۔ قطعہ تاریخ۔ قصیدہ

اتحادِ حقیقی

تعینات کے پردوں کو چاک کر ڈالو — جدھر نہیں ہے تعین اُدھر نظر ڈالو
جو کچھ خیال و نظر کی طلسم سازی ہے — حقیقتاً وہ حقیقی نہیں مجازی ہے
یہ پیش و پس یہ یمین و یسار و پست و بلند — تخیلات نے ڈالی ہے ان پر اپنی کمند
توہمات نے جب سے بشر کو گھیرا ہے — مجالسِ خرد و وہم میں اندھیرا ہے
بشر کے حق میں عناصر کی چار دیواری — نہیں ہے مانعِ آزادی و روا داری
بہ غور دیکھیے آب و ہوا و آتش و خاک — بہم ہیں ضد کوئی سوزندہ ہے کوئی غمناک
مگر جو ربط بڑھا ان میں حکمِ قدرت سے — تو جلوہ گر ہوئے وحدت میں بزمِ کثرت سے
یہی مناظر یہ نوعِ بشر کے ہیں جوہر — نظر میں دو ہیں مگر دل میں ہیں بہم یکسر
سری کرشن کہ بھگوان بدھ کہ راجہ رام — ہوئے ہیں صرف تعارف کے واسطے یہ نام
وگرنہ کام میں ان سب کا رنگِ وحدت ہے — نہ اختلاف ہے باہم نہ کچھ کدورت ہے
ازل سے نورِ مجسم یہ بن کے آئے ہیں — بس ایک شمع ہدایت سے لو لگائے ہیں
پیامِ امن و اماں ان کا اک تکلم ہے — انہیں سے داد طلب صاحبِ تظلم ہے
یہ حجتیں نہیں کرتے ہیں شور و غل کیلئے — ہر ایک جنگ ہے ان سب کی صلحِ کل کیلئے
بجائے خود انہیں نفرت کسی بشر سے نہیں — خمیر خیر سے ان کا اُٹھا ہے شر سے نہیں
خدا کے بندوں میں تفریق یہ نہیں کرتے — غلط اصول کی تصدیق یہ نہیں کرتے

ہر ایک پنتھ میں ملتے ہیں ایسے نیک نہاد
نہ کیوں ملیں کہ یہ نص ہے بکلِّ قومٍ ھاد

سرگرانیاں

ناکارہ ہستیوں کی کیا زندگانیاں ہیں — ہاں کام کرنے والے جانِ جہانیاں ہیں
دُنیا میں ہیں وہ شاداں دنیا ہو اُنکی خواہاں — کاموں پہ جن کے نازاں خود کامرانیاں ہیں
کل تک تو سرگراں تھے حالی سے یار ان کے — حالی کو آج ان سے کچھ سرگرانیاں ہیں
ہو کیوں نہ سرگرانی، ہو کیوں نہ بدگمانی — غائب ترقیوں کی ساری نشانیاں ہیں
ہے جنسِ علم ارزاں سب کیلئے جہاں میں — قحطِ عمل سے لیکن ہم میں گرانیاں ہیں
اسباب ہیں میسّر، سامان ہیں فراہم — کم ہمتی کی پھر کیوں ریشہ دوانیاں ہیں
سُن لو بہ گوشِ رغبت، چُن لو گلِ نصیحت — رشکِ بہارِ جنت یہ گُل فشانیاں ہیں

کھیتوں کو دے[۱] لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کرلو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

فریبِ ہستی

مخلوقِ خدا جہاں کہیں ہے — اک ہستیِ نیستی قریں ہے
انجم، قمر، آفتاب، افلاک — جلوہ اُن سب کا یا یقیں ہے
لیکن یہ یقین بطورِ اذعان — بے حُجّت بے چناں چنیں ہے
سُن سُن کے جما لیا ہے دل میں — تحقیق کا کون خوشہ چیں ہے
ہستی کی طلسم سازیوں میں — اک خواب و خیال جاگزیں ہے
اس خواب و خیال کی بدولت — دھوکے میں نگاہِ خوردبیں ہے
فانی کو سمجھ لیا ہے باقی — غائب پہ گمانِ حاضریں ہے
زنگی موسوم ہے بہ کافور — متوالا عاقل و ذہیں ہے

۱ حالی

رنگین میوے کا نام نارنگ — میٹھا کھٹے کا جانشیں ہے
بے بہرۂ گوش و ہوش بہرا — اعمیٰ چشم و چراغ دیں ہے
چلتی ہوئی شے کا نام گاڑی — کھویا گھل مل کے خوش تریں ہے
القصہ جدھر بہ غور دیکھا — ہر رنگ برعکس ہر کہیں ہے
بے شبہ یہ سازشِ زمانہ — دو دن کی نمائشِ زمیں ہے
پھیلا ہے جو سازِ دلکشی کا — پھندا ہے، کمند ہے، کمیں ہے
بچتے رہنا مدام اس سے — یہ یار وہ مارِ آستیں ہے
جس سے ہوئی تلخ جانِ شیریں — زہراب بہ شکلِ انگبیں ہے
سن لو غالب سے نکتہ داں کا — اک شعر جو وجد آفریں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شاعری کا ایک رُخ

شاعری کا جذبہ ہر دل کے نہاں خانے میں ہے — لیکن اظہار اس کا اکثر اہل افسانے میں ہے
کوئی کہتا ہے ازل کے دن سے ہوں مستِ الست — کوئی کہتا ہے وہ عالم ایک پیمانے میں ہے
کوئی کہتا ہے کہ دل ہے سرد مہری سے تپاں — کوئی کہتا ہے کہ ٹھنڈک آگ بھڑکانے میں ہے
کوئی کہتا ہے کہ بے نوشی میں لطفِ ہوش ہے — کوئی کہتا ہے مزا پی کر بہک جانے میں ہے
کوئی کہتا ہے کہ اک قطرہ بھی ملتا نہیں — کوئی کہتا ہے وہ سب پی لوں جو میخانے میں ہے
اک طرف اپنی پریشانی میں دل الجھا ہوا — اک طرف مصروف کوئی زلف سلجھانے میں ہے
اس طرف گم کردہ منزل پھر رہے ہیں راہ گیر — اس طرف اک رہنما مصروف بہکانے میں ہے
کوئی سچا ترجمانِ دردِ دل ملتا نہیں — ہر یگانے میں وہ خصلت ہے جو بیگانے میں ہے

کوئی یہ کہتا نہیں، کہتے ہو کچھ کرتے ہو کچھ
راستی کا لطف ان دونوں کے مل جانے میں ہے

بے ضرورت، بے نتیجہ، بے محل، بے فائدہ
محو ہر اک شعر کہنے اور کہوانے میں ہے

شاعری اور اسکی خوبی میں نہیں کوئی کلام
گفتگو بے وقت کے مصروف ہو جانے میں ہے

قدر ہوتی ہے اسی شاعر کی بزمِ شعر میں
جس اطائی کو مہارت کچھ نہ کچھ گانے میں ہے

سبب یہ ہے تو عقل کہتی ہے کہ لطف و دلکشی
شاعروں سے بڑھ کے قوالوں کے بلوانے میں ہے

شاعری کی جس جگہ یہ گت ہے احسن تو وہاں
منہمک اک بے سُری آواز پہچانے میں ہے

نقشِ عبرت

زمانے کے موافق کب زمانے کے بشر ہوں گے
الٰہی وہ بھی دن ہوگا کہ سب شیر و شکر ہوں گے

چلیں گی آندھیاں بغض و حسد کی ہند میں کب تک
ہم اوراقِ پریشاں بن کے کب تک منتشر ہوں گے

سلامت ہے جو فقر و جہل موجودہ تو آئندہ
نہ ہم اہلِ دول ہوں گے نہ ہم اہلِ ہنر ہوں گے

خبر گھر کی نہیں لیکن نظر ہے نجد و کنعاں پر
بہت کم دور بیں ہم سے کہیں اہلِ نظر ہوں گے

اگر سینچی گئی کشتِ عمل خونِ مشقت سے
تو اشجارِ امل سرسبز ہوں گے بار ور ہوں گے

روا داری، ملنساری، خوش اطواری، گرانباری
انہیں کے بین الاقوامی مفاسد بے اثر ہوں گے

ہمیں دورِ تغیر سے مٹیں گے ورنہ دنیا میں
یہی شام و سحر ہوگی، یہی شمس و قمر ہوں گے

حوادث زلزلوں کے، قحط کے امساکِ باراں کے
ق ہماری ہی بداعمالی سے ہوں گے جس قدر ہوں گے

اثر قربِ قیامت کا ہے ظاہر ان عذابوں سے
کہ ہونے تھے بہت کم پیشتر اب بیشتر ہوں گے

رہیں گی نقشِ عبرت بن کے احسن میری یہ باتیں
نہ ہوگا تو جہاں میں تذکرے تیرے مگر ہوں گے

شاعر کے مشاغل

کیوں پوچھ رہا ہے کوئی احسن کے مشاغل
کیا حسنِ عمل دفترِ عصیاں میں ملے گا

اوقات ہیں بے ضابطہ حالات ہیں بے ربط
ہر وقت وہ فکرِ غمِ دوراں میں ملے گا

اس پر بھی ہے اصرار اگر تم کو تو سن لو
آوارہ دو زنگی کے بیاباں میں ملے گا

یا صبح کو ہوگا وہ مصلے پہ نمایاں
یا خفتہ کسی گوشۂ پنہاں میں ملے گا

جب تک نہ ڈھلے دوپہر اس وقت تک اُس کو
ڈھونڈو گے تو اطفالِ دبستاں میں ملے گا

دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک
سویا ہوا، بیٹھا ہوا، ایواں میں ملے گا

پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک
مشغول ملاقاتِ عزیزاں میں ملے گا

ہوگی پسِ مغرب جو تلاش اس کی تو اکثر
پڑھتا ہوا کچھ بزمِ شبستاں میں ملے گا

ہوگا انھیں اوقات میں جو وقت میسر
سرگرمِ عمل شعر کے میداں میں ملے گا

جب تا بہ کمر زلفِ قصب آجائے گی اسکو
پہلوئے سکوں، خوابِ پریشاں میں ملے گا

القصہ جو ہے آج یہاں محوِ تکلم!
لب بستہ وہ کل شہرِ خموشاں میں ملے گا

قصیدہ استقبالی [۱]

کیا کہوں شوقِ بیاں کا جوش کتنا دل میں ہے
ایک دریا ہے کہ لہراتا ہوا سا دل میں ہے

شرح صد معنی ہے جس کا نقطہ نقطہ حرف حرف
اس سفینے کی جگہ سینے میں ہو اللہ رے ظرف

شوق کہتا ہے کہے جا جس قدر تو کہہ سکے
جوش کہتا ہے بہے یہ چشم جتنا بہہ سکے

لیکن افراطِ مسرت کا یہ عالم ہے عیاں
جز مسرت لب پر آتا ہی نہیں کوئی بیاں

[۱] یہ قصیدہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے وائس چانسلر ہونے کے موقع پر کہا گیا تھا۔

لفظ ہیں مہمل، تلفظ کا اگر یارا نہ ہو
ہائے وہ بے چارگی جس کا کوئی چارا نہ ہو

جوشِ گویائی کو اسلوبِ بیاں ملتا نہیں
لب ہلانا چاہتا ہوں میں مگر ہلتا نہیں

دب گئے ہیں سب خیالات اک خوشی کے سامنے
نطق کی طاقت ہے زائل خامشی کے سامنے

ہے مگر یہ خامشی اس سرخوشی کی ہم ردیف
جسکے جذباتِ طرب افزا ہیں ہے کیفِ لطیف

ہر دلِ جویا کو فکرِ انکشافِ حال ہے!
ہر لبِ گویا پہ ذکرِ خیرِ استقبال ہے

حبذا اے طالعِ خورشید طلعت حبذا
مرحبا اے نیرِ بیدار قسمت مرحبا

گوہرِ نایاب دریائے ہنر ہاتھ آگیا
ڈھونڈتے پھرتے تھے جسکا ساتھ وہ ساتھ آگیا

اس خبر نے جبکہ پھیلائی بساطِ انبساط
ہوگیا بچھڑے ہوؤں میں اختلاط و ارتباط

فرشِ رہِ دل، جملہ مشتاقانِ آمد کا ہوا
خیر مقدم یوں ضیاء الدین احمد کا ہوا

او ز تنہا رفتہ بودہ زیں چمن بہرِ خرام
دیدۂ احباب و دل ہمراہ او ماندہ مدام

عارضی پردہ کوئی دائم رہا کرتا نہیں
ابر اوڑھے مہر پر قائم رہا کرتا نہیں

کیوں نہ آتے، کیوں نہ لاتے، کیوں نہ پاتے ہم انھیں
روٹھتے اک دن نہ سو دن تک مناتے ہم انھیں

ہم ہیں انکے وہ ہمارے، سب کی یونیورسٹی
جب نہ ہوں یک سو تو کس مطلب کی یونیورسٹی

انکی آمد ہے کہ دیکھا جب انھیں جاتے ہوئے (ق)
کی دعائیں سب نے یوں ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے

یا الٰہی ہو یہ جانا، اُن کے آنے کے لئے
منقلب اقوالِ کہنہ ہوں زمانے کے لئے

سینکڑوں آتے ہیں جاتے ہیں ہزاروں باکمال
ایسے آنے جانے کی لیکن نہیں ملتی مثال

خود گئے خود آگئے، خود مل گئے خود من گئے
پھر پرو وائس سے وائس چانسلر وہ بن گئے

ہر طبیعت ہے سکوں آمیز، ہر دل شاد ہے
اور اک اک کی زباں پر یہ مبارکباد ہے

یوسفِ گم گشتہ باز آمد بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شدہ اکنوں گلستاں غم مخور

قدم بڑھائے چلو

گزر رہی ہے شب تار ہو رہی ہے سحر   شعاعِ مہر چمکتی ہے ڈوبتا ہے قمر
کڑی ہے منزلِ مقصود دور کا ہے سفر   سنو سنو کہ تمھیں کیا سُنا رہا ہے گجر
خیالِ وقت کا رکھو قدم بڑھائے چلو

دکھاؤ ہمتِ مردانہ کی اولعزمی   قدم بڑھاؤ تو اس میں ہو قوتِ جزمی
سُناؤ خیبر و خندق کے قصۂ رزمی   جماؤ حیدر و سلماں کے نقش ہم بزمی
نشانِ یک جہتی ہر طرف بٹھائے چلو

ہمارے قافلے والے اگرچہ کم سن ہیں   بڑے بڑے نگران کے معین و ضامن ہیں
خلوص ساتھ میں ہے ہمتیں معاون ہیں   بس اب نہ دیر کرو کام کے یہی دن ہیں
ہر ایک حیلہ و حجت کو تم بُھلا کے چلو

کرو گذشتہ تساہل کا اب نہ رنج و ملال   گذر گیا جو زمانہ ہوا وہ خواب و خیال
یہی مناسب و موزونِ وقت ہے فی الحال   بجائے ذکرِ گذشتہ ہو فکرِ استقبال
نہ پستیوں سے ڈرو ہمتیں بڑھا کے چلو

جہاں جہاں نظر آتی ہو راہ ناہموار   مٹاؤ سعی سے اپنی وہ سب بُرے آثار
مثال بن کے رہے گی تمھاری یہ رفتار   بناؤ اپنی روش کو تم اس طرح باکار
قدم قدم پہ نشانِ سفر بناتے چلو

سلف کی یاد رہے لیکن اس طرح نہ رہے   کہ ہم کو ایک جہاں استخواں فروش کہے
وہ دل ہے، قوم کی خاطر جو ظلم و جور سہے   بجا ہے آنکھ سے اُسکی جو دُرِ اشک گرے
سبق جو بھول گئے ہیں انھیں پڑھا کے چلو

طریق علم و عمل کو نہ چھوڑنا ہرگز   ہزار عزم ہوں مگر موں نہ موڑنا ہرگز

نہ ربطِ پستیٔ ہمت سے جوڑنا ہرگز — جو اُس دل میں ہے اس کو نہ توڑنا ہرگز
فروغِ شمعِ تمنا سے لَو لگائے چلو

رُباعیات[۱]

ہے وہم کہ مائل بہ جفا ہے ساقی — لیکن یہ غلط کہ بے وفا ہے ساقی
البتہ عدم توجہی سے اُس کی — ہوتا ہے یہ شبہ کچھ خفا ہے ساقی

کیوں بادہ کشوں سے ہو تغافل ساقی — مینائے سخن، سنائے قلقل ساقی
ہو چشمِ کرم تشنگیٔ پیہم پر — ٹوٹے نہ ترا دورِ تسلسل ساقی

جب تک ہوتا نہیں ملاقی ساقی — رہتا ہے زباں پر مری ساقی ساقی
پوری بوتل اگر نہیں دے سکتا — دے ڈال وہی جو کچھ ہو باقی ساقی

جو حُسنِ سخن کا ہے مشاہد ساقی — ہے خشک مزاج وہ نہ زاہد ساقی
ہو کیوں نہ پرستارِ خمستانِ ادب — احسنؔ عاشق ہے اور شاہد ساقی

عورت کے بغیر

عیش و عشرت نہیں عورت کے بغیر — گھر میں جنت نہیں عورت کے بغیر
کہتے ہیں گھر متمدن جس کو — فی الحقیقت نہیں عورت کے بغیر
مرد زر جمع کرے لاکھ مگر — کچھ حفاظت نہیں عورت کے بغیر
ہوں سب اسباب معیشت لیکن — دل کو فرحت نہیں عورت کے بغیر
صاحبِ مال ہوا مرد تو کیا — با فراغت نہیں عورت کے بغیر

۱؎ یہ رسالہ "ساقی" جو شاہد احمد صاحب نبیرہ نذیر احمد صاحب مرحوم دہلی سے نکالتے تھے کچھ مدت تک مولانا کو نہ مل سکا، مفصلہ بالا رباعیات اسی حقیقت کی ترجمان ہیں۔

دل رہے جس سے شگفتہ ایسی — کوئی صورت نہیں عورت کے بغیر
خدمتی ہوں حبشی لاکھ غلام — حسنِ خدمت نہیں عورت کے بغیر
بعد مرنے کے بھی حوروں کی قسم — لطفِ جنت نہیں عورت کے بغیر
من و سلویٰ ہی نہ کیوں خوان پہ ہو — اس میں لذت نہیں عورت کے بغیر
مہرباں مرد ہو بچوں پہ تو کیا — اُن پہ رحمت نہیں عورت کے بغیر
گرچہ بٹتا رہے گھر میں لنگر — خیر و برکت نہیں عورت کے بغیر
بزمِ دُنیا میں مکمل انساں — حسبِ فطرت نہیں عورت کے بغیر
اہلِ دُنیا کے لئے دُنیا میں — پاک صحبت نہیں عورت کے بغیر
جانتے ہیں متاہل اس کو — حفظ صحت نہیں عورت کے بغیر
ترکِ لذات ہے کفرانِ نعمت — اجرِ طاعت نہیں عورت کے بغیر
چکی، چولھا ہو کہ ہنڈیا ڈوئی — ان کی زینت نہیں عورت کے بغیر
سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ مرد — نیک نیت نہیں عورت کے بغیر
پارسا مرد بھی ہیں گرچہ مگر — قدرِ عفت نہیں عورت کے بغیر
تسم نہیں مرد کے حق میں گو علم — مگر امرت نہیں عورت کے بغیر
اس گزرگاہ میں مردوں کے لئے — اچھی سنگت نہیں عورت کے بغیر

الغرض دونوں جہاں میں احسن
کچھ ضرورت نہیں عورت کے بغیر

مُلکی زبان

ہر قوم ہر ادب کی عیاں جس سے شان ہو — ہندوستان میں وہی مُلکی زبان ہو
پھیلا ہوا ہو ایک سا جال اس کا ہر طرف — پہنچی ہوئی یہ ہند سے تا اصفہان ہو

بھاگا، کہ سنسکرت ہو، تازی کہ فارسی
اُردو کا سب سے میل ہے سب سے ملان ہے

باہر سے آئی بھی ہے گھروں میں بنی بھی ہے
مہمان بھی یہی ہے، یہی میزبان ہے

لب تک نہ لائے کوئی یہ بات اور ہے مگر
دل میں اسی کا سب کو خیال و دھیان ہے

فرضی نہیں ہے بلکہ یہ سچا بیان ہے
آگاہ اس کے حال سے سارا جہان ہے

جتنی دبی ہے اُتنی ہی اُبھری ہے بارہا
اللہ رکھے اس کی عجب آن بان ہے

پلے پڑا اگرچہ ہے مگر اللہ ری ہمتیں
جس سرزمین پہ ہے فلک تک اُڑان ہے

پچھم سے پورب اور دکن سے شمال تک
دیکھو جدھر اسی کا نمایاں نشان ہے

سب اسکو جانتے ہیں یہ ہے سب سے آشنا
شہری نہ اجنبی ہے نہ بیری کسان ہے

رائج عوام میں بھی ہے بالکل اسی طرح
جیسے خواص کے لئے یہ ترجمان ہے

نغموں کو اسکے کیوں نہ سُنے شوق سے ہر ایک
دلکش ہے دلپسند ہے جو اس کی تان ہے

چٹخارے ہر زبان کے اُردو میں کیوں نہ ہوں
دُنیا کے ہر مذاق سے پُر اس کا خوان ہے

موتی کی طرح اسکا ہر اک حرف ہے سڈول
گویا کہ یہ ڈھلے ہوئے لفظوں کی کان ہے

سختی، اکر خنگی سے اسے کیا ہے واسطہ
بوجھل ذرا نہیں ہے بہت دھان پان ہے

ہر چند ساڑھے چھ سو برس کی ہے پیر زال
لیکن خدا کے فضل سے ہمت جوان ہے

کیا کیا بیان کیجئے اُردو کی خوبیاں
ہے سادگی کی روح سلاست کی جان ہے

کایا پلٹ ہوئی ہے مگر آج کل یہ کیا
جو مہربان تھا وہی نامہربان ہے

یہ باغ مشترک ہے کہ جس کا ہر حصہ دار
ہندوستانیوں میں ہر اک باغبان ہے

گر مشترک ادب کو مکاں فرض کیجئے
اردو زبان اس کے لئے سائبان ہے

مُسلم ہوں یا ہنود محافظ سب اسکے ہیں
دربان ہے کوئی تو کوئی پاسبان ہے

اس کے سوا ہزار زبانیں سہی مگر
پکوان سب کے پھیکے ہیں اُونچی دُکان ہے

اس کو حریف جان رہے ہیں نحیف کیوں
دل اس کا ہے ضعیف نہ خود ناتوان ہے

بتیس دانتوں میں ہے زباں کی طرح مگر
اس کی محافظت میں خدا کی اماں ہے

ہمت اگر قوی ہے تو مشکل کا غم نہیں
مانا زمین سخت ہے، دور آسمان ہے

نادان داؤں پیچ دکھاتے رہیں ہزار
دبتا نہیں کسی سے یہ وہ پہلوان ہے

انصاف سے بتائیے اردو سے اجنبی
ہندوستان بھر میں کوئی خاندان ہے

احباب کو حصار سے اردو کے ہے گریز
کہتے ہیں اپنے گھر کو پرایا مکان ہے

ہر لمحہ اعتراض کے برسا رہے ہیں تیر
ہر لحظہ تیوری کی کشیدہ کمان ہے

کب تک کہیں کہاں تک اسے طول دیں بس اب
اردو سے آخری یہ ہمارا بیان ہے

اپنے مخالفین کے سن سن کے اعتراض
دل پر نہ بیل لا یہ ترا امتحان ہے

بے شبہ اس زمیں کی ہے تو مشترک زباں
آباد جتنے رقبہ میں ہندوستان ہے

بنیاد تیری ہل نہ سکے گی ہلانے سے
ہوگی نہ ٹس سے مس کہ اٹل یہ چٹان ہے

کچھ بھی کہا کرے کوئی اپنا یہ قول ہے
تیرے ہی ہم ہیں تو ہی ہماری زبان ہے

بدیسی اور دیسی

ایک ہندی نے کیا صاحب بہادر سے خطاب
دیس سے پردیس میں تشریف لائے کیوں جناب

کیا طبیعت کے مخالف تھی وہاں کی بود و باش
یا خلل انداز تھا کوئی حریفِ بدقماش

تھی ستم آلودہ فضا یا تھی خراب آب و ہوا
یا مرض تھا کوئی یورپ میں نہ تھی جسکی دوا

رہنے سہنے کو نہ تھی کافی ولایت کی زمیں
ہند کے کالوں سے کیا بہتر نہ تھے گورے حسیں

کیوں ہوئی مرغوب یہ غربت وطن رکھتے ہوئے
کس لئے صحرا نوردی کی چمن رکھتے ہوئے

یہ تکلم، یہ تخاطب منقطع جب ہو چکا
ہنس کے یوں صاحب بہادر نے مخاطب سے کہا

ان سوالوں پر مجھے رہ رہ کے آتی ہے ہنسی
آپکی گردن ہے کن ڈھبوں کے پھندوں میں پھنسی

بود و باشِ ملک سے کیوں دل ہمارا تنگ ہو
تختِ جمہوری پہ کیوں کر انفرادی جنگ ہو

فرحت افزا ہو فضا آب و ہوا بھی ہو مفید
ہر دوا موجود ہے اکثر مرض ہیں ناپدید

ہیں تمدن اور معیشت کے ہزاروں راستے
حُسن کے نظارے بھی ہیں عام سب کے واسطے

جسکو غربت آپ کہتے ہیں وہ ہو راحت فزا
دیس کا پردیس میں رہ کر اُٹھاتے ہیں مزا

ان سوالوں پر تعجب ہی نہیں حیرت بھی ہو
ایسے فہم و ہوش کی اس عہد میں خلقت بھی ہو

کوششیں رہتی ہیں جاری اپنی وسعت کیلئے
ہم سفر کرتے ہیں توسیعِ حکومت کے لئے

فکر رہتی ہے ترقی کی ہمیں شام و سحر
بے ترقی کے جئے انساں تو ہے وہ جانور

خدمتِ ملکی و قومی اپنا فرضِ عین ہے
فرد، فرد اس سعی و کوشش کیلئے بےچین ہو

ہم کہیں ہوں لیکن اپنے ملک کے ہیں جاں نثار
ہر طرح ہر حال میں ہیں قوم کے خدمتگزار

یہ حقیقت کیا وہ سمجھیں ہیں جو بھوروں کے پلے
اُن سے پوچھو جن کے ہیں دن رات ایسے مشغلے

آج مغرب میں نہاں ہیں کل ہیں مشرق میں عیاں
کرتے رہتے ہیں زمیں سے اُڑ کے سیرِ آسماں

قصہ کوتہ، ہے یہی گھر سے نکلنے کی غرض
ورنہ ہم کو ملک سے نفرت، نہ کوئی ہو مرض

سُن کے ہندی نے یہ سب صاحب بہادر سے کہا
جانتے ہیں آپ جب پردیس کو گھر سے سوا

پھر یہ کیسی اجنبیت ہو کہ رہتے ہیں جہاں
ہے معیشت سے وہاں کی نفرتِ کُلّی عیاں

ہے جُدا طرزِ تکلم، ہے الگ جائے قیام
ہے نیا ملبوس بھی، ہے نئی قسم طعام

ہند کی آب و ہوا میں جو نہیں موزوں لباس
ہر گھڑی ہر دم اسی کا آپ کو رہتا ہو پاس

کس طرح ہوگا موافق یہ مخالف امتزاج
گرم خطے میں رہے کیوں سرد ملکوں کا رواج

سانگ سے بدتر نہ کیوں ہر اک بدیسی بھیس ہو
بھیس ہونا چاہئے ویسا ہی جیسا دیس ہو

سُن کے یہ تقریر پھر صاحب بہادر نے کہا
آپ نے جو کچھ کہا وہ ایک حد تک ہے بجا

سنیے اب اس کی حقیقت کیجیے پرجا جو اس
ہم کہیں رہ کر بدل سکتے نہیں اپنا لباس

حدتِ گرما ہو، یا ہو شدتِ سرما کہیں
حسیاتِ اعتباری کی ہمیں پروا نہیں

عادتوں پر ہوتی ہیں سب ایسی باتیں منحصر
جس کو سمجھو ہی مفید اور جس کو سمجھو ہی مُضر

اپنی رسمیں کیوں بدل دیں وہ پرائے دیس میں
جو بدل لیتے ہوں پردیسی کو اپنے بھیس میں

ہے اثر چاروں طرف اپنا یہ پھیلایا ہوا
ساری دُنیا پر ہمارا رنگ ہی چھایا ہوا

عبرت اے اہلِ خرد ہشیار اے ہندوستاں
ہوتے ہیں دنیا میں اس صورت سے ابنائے زماں

جس جگہ جس ملک میں جس دیس میں رہتے ہیں وہ
اپنی دُھن میں اور اپنے بھیس میں رہتے ہیں وہ

اہلِ یورپ کی یہ ہے قومی خصوصیت عیاں
بیش و کم دو سو برس سے ہند پر ہیں حکمراں

لیکن اس مدت میں اپنا ڈھنگ کچھ بدلا نہیں
رنگ جیسا صاف تھا ویسا ہی ہے گدلا نہیں

سخت ہو کتنا ہی جاڑا تیز ہو کتنی ہی دھوپ
اُن کا ہر موسم میں رہتا ہے ہمیشہ ایک روپ

جوتیاں دلّی کی ہوں یا لکھنؤ کی ٹوپیاں
ساڑیاں کاشی کی، جنکو باندھتی ہیں گوپیاں

کیسی ہی اچھی ہوں وہ لیکن انھیں بھاتی نہیں
اُن کے استعمال میں اشیائے ہند آتی نہیں

ایک ملبوسات و ماکولات و مشروبات کیا
جملہ قول و فعل میں پرہیز ہے ہر بات کا

علم و فن کے حامی و ناشر ہیں وہ بیشک مگر
اپنے لٹریچر پہ ہے ان کی توجہ سر بسر

جو زبانیں ہند میں مشہور ہیں بین العوام
برج بھاشا کہئیے یا اُردو کہ ہندی لیجئے نام

ان زبانوں میں کسی سے بھی انھیں مطلب نہیں
بولتے ہیں کس طرح، انکو کچھ اسکا ڈھب نہیں

اب میں کہنا چاہتا ہوں بے تعصب اصل بات
حُبِ قومی کے مؤید ہیں یہ سارے واقعات

درحقیقت قوم بنتی ہے انھیں آثار سے
ملتی ہیں راہیں ترقی کی اسی رفتار سے

ہم کہ پاسِ ملک و حُبِ قوم کے ہیں مدعی
اپنے کاموں میں نہیں کرتے ہیں سعیِ واقعی

یاد ہیں باتیں بنانے کے ہزاروں داؤ پیچ
لیکن از روئے عمل دیکھو تو گویا ہم ہیں ہیچ

وضع و صورت، رسم و عادت، گفتگو، ماند و بود
سب میں ہے اندازِ یورپ کی نمائش اور نمود

ٹائی، کالر، سوٹ، مفلر، ہر جگہ موجود ہیں
ٹوپی، کُرتے بے کفوں کے بیشتر مفقود ہیں

دیکھئے صورت تو اس سے سادہ لوحی ہے عیاں
عورتوں کا سر بسر مردوں پہ ہوتا ہے گماں

ملکوں میں اُردو و ہندی کا جھگڑا ہے بہم — لیکن انگریزی سے رغبت بڑھ رہی ہے دمبدم
جُمعہ یا ئسگر سنیچر شنبہ کہتا ہے گراں — سنڈے منڈے تھرس ڈے پر خوب کھلتی ہے زباں
انجمن ساز آج ہیں افراد ملکی جس قدر — بولتے ہیں سب کے سب دیسی زبانیں اپنے گھر
موقع تقریر پہ لیکن جب مقرر کو ملے — صرف انگریزی تلفظ پر لبِ گویا ہلے
کوئی صوبہ کوئی شہر ایسا نہیں آتا نظر — جس میں اہلِ ملک کی ہو وضع یکساں سربسر
صوبہ جاتِ متحد ہوں، ڈھاکہ یا بنگال ہو — یا جنوبِ ہند، یا پنجاب، یا نیپال ہو
ہر جگہ اوضاع و اطوار اک نئی صورت میں ہیں — جو اڑیسہ میں ہیں شکلیں وہ کہاں سورت میں ہیں
لکھنؤ کی واللہ باللہ، حیدرآبادی سلام — جھنگ اور سرہند کی پُرشور آہنگِ کلام
زمیاں پورب کی تشدید سہارنپور کی — ہیں یہ تشبیہات گویا سنگ اور بلور بھی
یہ دکھایا ہے بہت کم اختلافِ صوبہ دار — شرح کی جائے تو ہو جائے وہ از یک تا ہزار
صوبہ داری اجنبیت سے جو ہو قطع نظر — پھر بھی وضعی اختلافات اسقدر ہیں جلوہ گر
دیکھ کر جن کو بجا رہتے نہیں ہوش و حواس — ایک ملک اور اس میں اتنا اختلاف بے قیاس
ایک گھر میں ہیں اگر دو بھائی مان جائیے مقیم — خانہ جنگی کے سبب آپس میں ہیں گویا غنیم
کلمہ گو آقا و خادم ایک ہی ہادی کے ہیں — رسم و عادت کے سبب دشمن وہ آزادی کے ہیں
ایک دستر خوان پہ دونوں بہم آتے نہیں — جان کر توہین، کھانا مل کے وہ کھاتے نہیں
اک طرف یہ، اک طرف وہ نفرتِ شربِ طعام — بھائی بھائی کی رسوئی کا الگ ہے انتظام
جب یہ حالت ہو تو پھر کس طرح ایکا ہو سکے — ایک ایکا ہو تو سو راجوں کا ٹھیکا ہو سکے
آہ کہتا ہوں بحسرت دیکھ کر یہ افتراق — انفراق اے حُبِّ قومی الوداع اے اتفاق

سرسید کا دل

دل کہ مجموعِ ہزار اعلام ہے — آئینہ بھی ایک اسی کا نام ہے
یہ سکندر ساز آئینہ نہیں — اس کا صانع خالقِ علّام ہے

دانش و بینش ہے جوہر اس کا خاص / حسن و ادراک اسکا وصفِ عام ہے
ہے ہراک کے ساتھ یہ پہلو نشیں / جو ہے اس سے دُور بے آرام ہے
اور آئینوں میں یہ جوہر کہاں / بس جہاں بینی اِسی کا کام ہے
اس جہاں بینی سے ملک و قوم میں / اس کو حاصل عزت و اکرام ہے
الغرض ایسا جو دل ہے آئینہ / دین و دُنیا میں وہ خوش فرجام ہے
تھا وہ دل سر سیّد احمد خاں کے پاس / جس کی یہ توضیح بے ابہام ہے
تھی یہ شہرت کب علی گڈھ کو نصیب / کول جس کا اک پُرانا نام ہے
ہے اسی چشمِ جہاں بیں کا یہ فیض / ہر اشارہ جس کا اک الہام ہے
کر دیا اس شہر کو دار العلوم / اب یہ گویا مرکزِ اقوام ہے

قطع کر دیں اس نے سب حد بندیاں
سب ہوں یک دل عام یہ اعلام ہے

تاریخ وفات

دُنیا کی زندگی سے کوئی کیا ہو مطمئن / ہوتے ہیں ایک دن میں ہزاروں ہی انقلاب
ہر آن اپنی شان دکھاتی ہے نو بہ نو / ہر دم ہے سوزِ دہر میں اک تازہ التہاب
المختصر تغیرِ پیہم سے رات دن / پھیلا ہے آسماں سے زمیں تک اک اضطراب
وہ آفتاب[1] احمدِ نام آورِ جہاں / واقف ہیں جسکے حال سے دُنیا کے شیخ و شاب
خدماتِ قوم و ملک و سیاست میں عمر بھر / مشغول و منہمک رہے بے خوف و بے حجاب
کی محنت اتنی آپ نے دار العلوم[2] میں / افراطِ کار و بار سے صحت ہوئی خراب
فالج کی بے خودی کا اثر دو برس رہا / زندہ رہے، مگر نہ رہی زندگی کی تاب

[1] - صاحبزادہ آفتاب احمد خاں علی گڈھ۔
[2] مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔

بالآخر آ گئی وہ گھڑی جو نہ رک سکی
ہر چند حکمتوں نے کیا لاکھ سدِ باب

شنبہ کو جنوری کی تھی اٹھارویں کہ آہ
بعدِ زوال مہر اُٹھا وہ فلک جناب

تاریخ جس کی احسنِ مغموم نے کہی
افسوس ہے غروب ہوا آج آفتاب
۱۹ ۶ ۳۰

سہرا

خوشی کا دن ہے مسرت کی داستاں کہیے
نویدِ شادیٔ احمد رؤف خاں[1] کہیے

جبینِ عالیٔ نوشہ کو آسماں کہیے
بلند مرتبہ سہرے کو کہکشاں کہیے

نہ کیوں ہو نخلِ تمنائے گلشنِ اب وعم
وہ نونہال جسے فخرِ خانداں کہیے

بنے گی میری سخن گستری نشاط افزا
بساطِ عیش بچھا دوں ابھی جہاں کہیے

اگرچہ عقد، مرادف گرہ کا ہے لیکن
یہی وہ رازِ نہاں ہے جسے عیاں کہیے

گلِ مراد بنا کھل کے غنچۂ خاطر
سرورِ عیش کو اس دن سے ہم قراں کہیے

خوشی ولادت و عقدِ پسر کی یکساں ہے
اسے مسرتِ دل اسکو عیشِ جاں کہیے

برات اس کی ہے محکوم اور وہ حاکم
جہانِ عیش کا نوشہ کو حکمراں کہیے

خموشیوں میں ہیں اس کی ہزار ہا معنی
لڑی کو سہرے کی ہرگز نہ بے زباں کہیے

جدھر پھرا سرِ نوشہ اُدھر جھکا سہرا
نہ کیوں پھر اسکو مطیع و مزاج داں کہیے

خوش آبیٔ گلِ تر کے سبب سے سہرے کو
نیوضِ حسن کا اک چشمہ رواں کہیے

جھکا ہوا سرِ نوشاہ پر جو ہے سہرا
نگاہ باز نہ کہیے، نگاہ باں کہیے

مبارک آپ کو ہو مولوی میاں[2] یہ خوشی
اس انبساط کو وجہِ سرورِ جاں کہیے

---

[1] ۔ نام ہے محمد جان خاں صاحب رئیس دادوں کے صاحبزادے کا۔

[2] ۔ عرف ہے محمد جان خاں صاحب کا جو دادوں ضلع علیگڈھ کے ایک رئیس تھے۔

رہے مجاز کا پردہ تو پھر حقیقتِ حال — حضورِ بارگہِ ربِّ دو جہاں کہیے
یہ جشن آج کا ہو عیشِ جاوداں یا رب — مری دعاؤں پہ آمین مہرباں کہیے

شگفتگی مرے سہرے میں جتنی ہے احسنؔ
اسے کرامتِ نوشاہِ نوجواں کہیے

سلام

(۱)

جو دل کہ مدحِ شہِ کربلا پسند کرے — کچھ اور بات پھر اس کی بلا پسند کرے
سوا حسینؑ کے یہ اور کس کا زہرہ ہے — جو ظلم و جور میں صبر و رضا پسند کرے
حرم کی پردہ دری ہو یہ کون چاہے گا — اسے یزید ہی سا بے حیا پسند کرے
وہ بوالہوس ہے ہوس نہیں ہے جو احمق — بجائے خاکِ شفا کیمیا پسند کرے
دہانِ تیغ بھی ہے تشنہ کام مثلِ حسینؑ — نہ کیوں وہ خون سرِ اشقیا پسند کرے
عدوئے عابدؑ بیمار تندرست نہ ہو — وہ سم ہو اُس کے لئے جو دوا پسند کرے
رفیق و دشمنِ حیدر کے استخواں میں ہے فرق — یہ سگ قبول کرے وہ ہما پسند کرے
غضب کہ خیمۂ آلِ عبا لٹے اور یوں — کوئی نقاب تو کوئی ردا پسند کرے

علیؑ کی مدح ہے بیشک رضائے حق احسنؔ
تو پھر وہ کیوں نہ کرے دل جو خدا پسند کرے

(۲)

ملے جو خدمت روح الامیں جناں کیلئے — سلام کہہ کے میں بھیجوں شہِ زماں کیلئے
غمِ حسین نہیں زیبِ داستاں کیلئے — یہ جزوِ دیں ہے یہ ایماں ہے دو جہاں کیلئے
جسے محاربۂ کربلا سمجھتے ہو — وہ جنگ تھی حق و باطل کے امتحاں کیلئے

زہے ثنائے علیؓ جھوم اٹھے فرشتے بھی
زباں ہوئی متحرک جو اس بیاں کیلئے

وہ کربلا کی زمیں ہے تمام ختم گئے
ستمگری کے جو پہلو تھے آسماں کیلئے

عدو کے جور سے شبیرؓ کو مدینے میں
ملا نہ گوشۂ راحت کوئی اماں کیلئے

وطن میں یوں رہے بے چین جس طرح بلبل
چمن میں رہ کے تڑپتی ہو آشیاں کیلئے

جہاں میں عزتِ مہماں ہے بالعموم مگر
بدل گیا تھا زمانہ شہِ زماں کیلئے

امام سے حرمِ محترم کی حرمت ہے
مکیں نہ ہو تو شرف کیا رہے مکاں کیلئے

کہا کسی نے جو آمادۂ سفر پاکر (ق)
کہ ہو رہی ہیں یہ تیاریاں کہاں کیلئے

حسینؓ رو کے یہ بولے چلا ہوں آہ وہاں
کوئی خوشی سے نہ آمادہ ہو جہاں کیلئے

وہ حلقِ پاک رہا ہے جو بوسہ گاہِ رسول
بنا ہے آہ وہ آماجگہ سناں کیلئے

عدو ہے جانِ ستمگر کا نالۂ مظلوم
وہی ہدف ہے اسی تیر بے کماں کیلئے

نہ کیوں قلمروِ دنیا و دیں ہو ملکِ حسینؓ
بنے ہیں کون و مکاں شاہِ دوجہاں کیلئے

ولائے آلِ محمدؐ نہ کیوں ہو فرض احسنؔ
کہ عشق عینِ عبادت ہے انس و جاں کیلئے

(۳)

نبیؐ کا نام ہے لب پر امام سے پہلے
درود بھیج رہا ہوں سلام سے پہلے

صفیں تھیں مقتدیوں کی امام سے پہلے
سحر ہوئی ہے قیامت کی شام سے پہلے

رضائے حق کا سبب امتِ محمدؐ نے
پڑھا حسین علیہ السلام سے پہلے

سنو حسینؑ سے تفسیرِ کاظمین الغیظ
خیالِ عفو رہا انتقام سے پہلے

وہی تھے مہتممِ جنگ مدعیِ حسینؑ
بلا چکے تھے جو خاص اہتمام سے پہلے

ملے نہ وارثِ کوثر کو ایک قطرۂ آب
یہ نظمِ ظلم تھا ہر انتظام سے پہلے

اگرچہ نہر پہ عباسؑ تھے مگر پانی
پیا گیا نہ شہِ تشنہ کام سے پہلے

حلال ہونے کو وہ کربلا میں جاتے ہیں
نہ نکلے جو کبھی بیت الحرام سے پہلے
کریں گے اہلِ ہوس قدر کیا قناعت کی
وہ چھٹ تو لیں طمعِ زر کے دام سے پہلے
ہوئے اصول سے غافل فروغ میں اُلجھے
یہ کی خواص نے بدعت عوام سے پہلے
نہ ہوتی بات اگر لن ترانی ہی کوئی
کلیم ہوش نہ کھوتے کلام سے پہلے
سوادِ ماریہ میں دیکھ کر نزولِ بلا (ق)
سفر کی فکر تھی شہ کو قیام سے پہلے
نگر نصیب کے چکر سے آئے پھر کے وہیں
اُٹھے تھے اُنکے قدم جس مقام سے پہلے

تری ولا سے ہے مولیٰ یہ شہرتِ احسنؔ
وگرنہ کون تھا واقف غلام سے پہلے

تضمین

احمدؐ کو مرتضیٰ سے جو تھی اُلفتِ دلی
ہجرت کی رات اس کی دلیل تو ہی ملی
مکے سے جب رسولؐ نے یثرب کی راہ لی
اس وقت قدر و عزتِ مشکل کشا کھُلی
ہیں پھول ایک گلشنِ وحدت کی اک کلی
یہ نسبتیں خفی نہ سمجھ بلکہ ہیں جلی
یعنی وہ ہے نبی، تو یہ اللہ کا ولی
جس پر حدیث لحمک لحمی ہے منجلی
جب ہے یہ اتحاد کی صورت ملی جُلی
پھر کیا عجب اگر پئے اثباتِ یک دلی
جائے رسولؐ خواب بہ بستر کند علیؑ[ا]
خود را فدائے جانِ پیمبرؐ کند علیؑ

خمسہ

حسینؑ خاصۂ حق سبطِ احمدؐ ابن علیؑ
جنابِ فاطمہؓ کے باغ کی شگفتہ کلی
امام عصر، نبیؐ کا وصی، خدا کا ولی
جب اس کے حلقِ مبارک پہ تیغ جور چلی

ا۔ یہ شعر سید مقبول عالم صاحب مارہروی کا ہے جو مولانا کے اجداد میں سے تھے، مولانا نے مصرعے لگا کر شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

نگاہ سوئے فلک کی زباں سے کچھ نہ کہا

سعادتوں سے پھرے داعیانِ کوفہ و شام
دیا بُلا کے نہ مہماں کو اپنے کچھ آرام
مگر وہ صابر و شاکر تھی ذاتِ پاک امام
کہ دیکھ کر ستم انسدادِ آب و طعام
خدا کا شکر کیا میزباں سے کچھ نہ کہا

قریبِ نہر جو شبیرؑ تشنہ لب پہنچا
تو آب آب ہوا قطرہ قطرہ دریا کا
یہ دیکھ کر لبِ جو روک کر قدم اپنا
بہائے آنسوؤں کے شہ نے آنکھ سے دریا
مگر فرات کے آبِ رواں سے کچھ نہ کہا

وہ بادشاہِ دو عالم وہ خلق کے سردار
بشر تو تھے مگر ایسے ملک ہوں جن پہ نثار
مدد کسی کی خدا کے سوا نہ تھی درکار
اُٹھائے رنج مگر باوجود حالتِ زار
جہاں پناہ نے اہلِ جہاں سے کچھ نہ کہا

جفا و جور کی تھیں جتنی صورتیں ممکن
دو چار ان سے رہی ارضِ کربلا میں دن
بچا نہ اُن سے کوئی طفل نوجوان و مُسِن
اعزّہ و رفقائے حسینؑ ہیں لیکن
کسی نے بھی کسی ایذا رساں سے کچھ نہ کہا

حسینؑ نے وہ دکھائی ہے صبرِ شانِ جمیل
کہ آج تک نہ ملی جس کی ایک بھی تمثیل
تکلّم اور خموشی کی ہو گئی تکمیل
سنو یہ کہنے نہ کہنے کی مختصر تفصیل
کہ سب خدا سے کہا این و آں سے کچھ نہ کہا

جو منکرِ حسینؑ ہوئے مرتضیٰ کے بعد
گویا پھرے خدا سے رسولِ خدا کے بعد
ایسا نہیں ہے کوئی بلا خیز سانحہ
محشر بھی ہے تو واقعۂ کربلا کے بعد
ہر چند انتقام کی قدرت تھی شاہ کو
لیکن وفا ہی کرتے رہے ہر جفا کے بعد
صبر ابتدا میں تلخ ہے ظلم ابتدا میں شہد ق
انجام ہے مگر یہ صواب و خطا کے بعد

نسلِ یزید ختم ہوئی چند سال میں
نسلِ حسینؑ اب بھی ہو زین العبا کے بعد

اُس کا وجود وہم، یہ موجود بالیقیں
کیا کیمیا کی فکر ہو خاکِ شفا کے بعد

کی شاہِ کربلا نے نہ اُف بھی زبان سے
ہر چند آئی ایک بلا اک بلا کے بعد

حد سے زیادہ اُس پہ ہوئی بارشِ عطا
نادم ہوا جو دل سے گناہ و خطا کے بعد

چھوڑی تھی جو خلافتِ ظاہر رسولؐ نے
دیکھی گئی نہ وہ حسنؑ مجتبیٰ کے بعد

کرتے ہیں نذرِ راہِ خدا میں جو اپنی جان
ملتی ہے نعمت انکو بقا کی فنا کے بعد

احسن تو ہی اُمید شفیع الامم سے ہے
لے جائیں گے بہشت میں رُوزِ جزا کے بعد

ترانۂ شکریہ[1]

شکر ہے تیرا ایزدِ متعال
کہ ہوئی جلوہ گر یہ صورتِ حال

زیرِ بارِ کرم کیا اُن کا
جن کے اکرام ہیں ترے افضال

ہیں محمد علی، اللہ بخش
نیک دل، نیک ذات، نیک خصال

سربسر حق پژوہ و نیک اندیش
ہمہ تن حق شناس و خیر سگال

قدر داں، قدر بیں و قدر شناس
جن کے ممنون ہیں سب اہلِ کمال

میں بھی آیا ہوں سُن کے اُن کا نام
کچھ نہیں اس میں جائے قیل و قال

ہوں ستم ہائے دہر سے نالاں
ہوں زمانے کے ہاتھ سے پامال

میں نے بہتوں کو آزمایا ہے
مشرق و مغرب و جنوب و شمال

سچ تو یہ ہے کہ آج دنیا میں
نہیں ملتی ہے مجکو ان کی مثال

جستجوئے فلاح میں میں نے
خوب دیکھا ہے اک جہاں کا حال

[1] یہ قصیدہ سیٹھ محمد علی اللہ بخش صاحب رئیس بمبئی کی شان میں کہا گیا تھا

جس طرح رُک گیا ہے قطب نما — مُڑ کے چاروں طرف سے سوئے شمال
یوں ہی مایوس ہو کے ہیں نے بھی — اُن کے در پر دیا ہے کندھا ڈال
ہوں علیؑ و محمدؐ و اللہ — نام نامی ہیں جن کے شامل حال
اُن کی بخشش کا پوچھنا کیا ہے — ہیں وہ دریائے لطف و جود و نوال
ختم کر احسنؔ اب دُعا پہ سخن — کہ ہے حاصل دلِ مفید مقال
آگ جبتک ہے دہر میں روشن — آب جبتک ہے بحر میں سیال
پھول جبتک ہوا سے کھِلتے ہیں — خاک سے جبتک اُگ رہے ہیں نہال

وہ سلامت رہیں بصد خوبی
دوستاں شاد، دُشمناں پامال

رُودادِ سرگزشت

بہ گوشِ ہوش یہ روداد سرگزشت[1] سُنو — کہ اس میں ہے پسِ منظر بھی پیشِ منظر بھی
اگرچہ آج یہ کم سن ہے اور دہ سالہ — مگر کل اس کو کہا جائے گا مُسن بھی
یہ آج قوم کی اصلاح کا پریچر ہے — کسی نے گرچہ کہا ہو اسے پھٹیچر بھی
مقاصد اس کے ہیں دو، پہلے پیٹ کا دھندا — اسی کے ساتھ ہے چندہ بصورتِ زر بھی
یہ ہیں وہ مقصدِ اصلی کہ ذمہ دار اسکے — رہیں گے جملہ خریدار بھی اڈیٹر بھی
علی گڈھ اور علی گڈھ کے جامعہ کیلئے — مشیر بھی ہے مددگار بھی ہے یاور بھی
اڈیٹر اس کا ہے پرہیزگار اگرچہ، مگر — رُکم ڈپی کو ہے پکچو کلب کا ممبر بھی
ضرور دیکھو اڈیٹر کو جا کے لیکن کب — جب اپنے گھر میں وہ ہوں اور کھلا ہو دفتر بھی

---

[1] ۔ سرگزشت نام کا ایک رسالہ علیگڈھ سے نکلتا تھا اس میں مزاحیہ انداز میں اکثر مفید نظم و نثر کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ سرگزشت کے ایڈیٹر نے اسکے دس سالہ اجراء پر ایک دعوت کی اس موقع پر مولانا نے یہ مزاحیہ نظم فرمائی۔

پلنگ پہ گو وہ نظر آئیں گے سوار مگر
معانقہ سے کریں گے مشرف اُٹھ کر بھی

پس از سلام کریں گے کلام بہر طعام
کہ نام کھانوں کے دل میں ہیں نقش از بر بھی

کھلائیں گے کبھی سیب اور کبھی انار انگور
پھر اس کے بعد پلائیں گے سوڈا واٹر بھی

مسز ہوں مس ہوں کہ بے بی یا کہ بابا لوگ
ہر اک کے حق میں وہ خواہر بھی ہیں برادر بھی

نہ کیوں ہوں اسمیں زن و مرد جلوہ گر یکجا
کہ سرگزشت مؤنث بھی ہے مذکّر بھی

قومی اِتّفاق

رحمتِ حق کا ہے دریا جوش پر آیا ہوا
اب ہے کیا دُشوار ملنا گوہرِ مقصود کا

ہاں مسلمانو! سُنو! سمجھو! اُٹھو! ہوشیار ہو
جو گیا وقت آج غفلت سے وہ کیا پھر آئیگا

اب سے تیرہ سو برس پہلے جو حالت اپنی تھی
وہ پلٹ آئے بعینہ ہے یہ جھوٹا ادّعا

ہاں مگر اس کل سے ملجائے اگر اک جزو بھی[1]
بس غنیمت جان کر اس پر کرو تم اکتفا

جن کے ہو تم نام لیوا جن کے ہو تم یادگار
اُن میں کیا پاسِ اخوّت انمیں کیا ایثار تھا

جاننا چاہو اگر اس کو تو قرآں میں پڑھو
سورۂ انساں کہ جس کی ابتدا ہل اتیٰ

حالتِ اصحابِ صفہ کوئی پوشیدہ نہیں
کیا کیا کرتے تھے انکے ساتھ قومی اغنیا

اپنی خدمت سے مقدّم اُنکی خدمت جانتے
ان کی حاجت کو سمجھتے اپنی حاجت سے سوا

تھا یہ کیوں؟ تھا اسلئے اسلام کی قوت بڑھے
اور جب اسلام کی قوت بڑھی تو کیا ہوا

یہ ہوا اسلام کے چاروں طرف حلقے بندھے
اور اُن حلقوں میں ذکرِ جبر تھا توحید کا

یہ ہوا کیوں؟ یہ ہوا محض اتّفاقِ قوم سے
برکتوں نے جس کی غیروں کو بھی اپنا کر دیا

اتفاقِ قوم سے مطلب یہی ہر گز نہیں
بیٹھ کر دو چار نے کچھ کہہ دیا کچھ سُن لیا

---

[1] ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ

بلکہ باہم بالعمل اس طرح رہنا چاہیے
جس طرح شیر و شکر مل کر نہیں ہوتے جُدا

میری اس بکواس سے نفرت نہ ہوتی ہو اگر
میری ان باتوں کو سُنتے ہو جو گوشِ اعتنا

پھر تامل کیا ہے بسم اللہ ہمت باندھیے
اچھے کاموں کے لئے کیا استخارہ دیکھنا

اپنے اگلوں کی مثالیں ایسی قائم کیجئے
آنے والی نسل اُٹھائے جس سے پورا فائدہ

کہہ گئے ہیں شیخ سعدی بھی اسی مضمون کو
جس میں تھوڑا سا تصرف کر لیا ہے جابجا

نامِ نیکِ رفتگانِ ناموراں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار اے باصفا

دُورنگیِ مُسلِم

مادرِ گیتی جسے کہتی ہے اپنا پیر زال
اتنی کہنہ ہے کہ آدم بھی ہیں اس سے خورد سال

لیکن اس عمرِ طوالت پر یہ حالت اس کی ہے
ہر گھڑی ہر لحظہ ہر آں اک نئی چلتی ہے چال

پھر بہ یک رو اس قدر محسوس تک ہوتی نہیں
گرد کو بھی اس کی پا سکتا نہیں پائے خیال

مستقل اس کی روش ہے منجمد اس کا خرام
پاؤں اس کے ڈگمگائیں لڑکھڑائیں کیا مجال

چلتی ہوتی ہے طویل العمر ہوتی ہے قوی
ہے عروجِ ارتقا اس کے لئے شدِّ رحال

آدمِ اوّل سے لے کر آدمِ آخر تک آج
اہلِ شرق اربابِ غرب اہلِ جنوب اہلِ شمال

جتنے ابنائے زماں پروردۂ آغوش ہیں
حسبِ استعداد کی جاتی ہے سب کی دیکھ بھال

اس کی پابندی سے ہر آزاد نے پایا فروغ
اس کی فرزندی سے ہر ناقص کو ہے حاصل کمال

اُن سپوتوں کو بتاتی ہے وہ رازِ ارتقا
جو سمجھتے ہیں کہ ماضی ہے سبق آموزِ حال

ہر گزشتہ چاہتا ہے بہتری آئندہ کی
وہ بُرا آغاز کب ہے جس کا ہو اچھا مآل

جس قدم کو ہر قدم، در پیشِ عذرِ لنگ ہو
منزلِ مقصود تک اس کو پہونچنا ہے محال

سچ ہے یہ ارشاد زیرِ پائے مادر ہے بہشت
منحرف جو ماں سے ہو اچھی نہیں اس کی سرشت

مصری و کلدانی و یونان کے اذکارِ قدیم
ہیں مزیّن جن سے تاریخوں کے اسفارِ ضخیم

جب تک اُن اقوام میں باقی تھا نظمِ اتحاد
سیکڑوں ہوتے تھے پیدا وقتِ واحد میں حکیم

مادرِ گیتی کی تعلیمات سے آگاہ تھے
یعنی اپنے وقت کی رفتار پہ تھے مستقیم

یہ وہ قومیں تھیں کہ تھا محدود جنکا کیش و دیں
اپنے ہی ملکوں میں سب مِل جُل کے رہتے تھے مقیم

وسعتِ آبادِ جہاں میں تھے ممالک اور بھی
اپنی ہی حد میں مگر باہم دگر رہتے ندیم

نام اشراقی و مشّائی کا ہم سنتے تو ہیں
ہے مگر سیرِ کتب تک اُن کا ہر فیضِ عمیم

ہاں! ہوئی جب غیرتِ حق بنکے رحمت جوش زن
سرزمینِ غیر زرعی میں چلی بادِ نسیم

کر دیا سرسبز اُس وادی کو نخلِ دشت سے
جس میں ابراہیم نے ڈالی تھی بنیادِ حریم

کس رعایا کا ہے ایسا راعیِ معجز نما
خلقتاً اُمّی ہو لیکن قدرتاً فخرِ کلیم

کج روی میں جکی پشتیں اور نسلیں کٹ گئیں
کر گئی ان سب کو سیدھا اسکی اک فہمِ سلیم

آگئی انسانیت، جاتی رہی حیوانیت
بھر دئے خلقت کی خلقت میں وہ اخلاقِ عظیم

نعمتِ حق کی جہاں تکمیل ہو اتمام ہو
کیوں وہاں سے رحمت و بخشش نہ سب پر عام ہو

ہو گیا جب مصر و یوناں میں کسادِ علم و فن
زندہ کس نے کیں دوبارہ وہ روایاتِ کہن

آج جس تعلیم پر اربابِ مغرب کو ہے ناز
کون ہو اسکا مربّی کس سے سیکھے یہ چلن

چونکہ یہ اذکار دہرائے گئے ہیں بار بار
اور مرغوبِ طبائع بھی نہیں طولِ سخن

اس لئے کہتا ہوں کچھ باتیں مفید و مختصر
تاکہ اس تمہید کا مطلب ہو واضح من و عن

صرف اظہارِ حقیقت مدعائے خاص ہو
یہ نہ سمجھے کوئی، ہوتا ہوں کسی پر طعنہ زن

ہے یہ دعویٰ اور اس دعوے کی ہے بیّن دلیل
قومِ مُسلم علم و حکمت میں ہے اُستادِ زمن

مختصر الفاظ میں کی جائے گی شرحِ دلیل
مان جائیں گے جو ہوں گے صاحبِ فہم و فطن

دینؐ دُنیا کے سکھائے اس نے امّت کو علوم
جو نہ تدریسِ کتابی سے تھا واقف مطلقاً

جن کو اس وہبی معلم سے ہو حاصل اکتساب — کس لیے منت کش وہ ہوں جز فضلِ ربِّ ذوالمنن
پائے ان علمی خزانوں کو حدودِ غیب سے — کر دیا مقسوم عالم بے خیالِ ما و من
کیوں نہ اُن کا فیض نامحدود ہوتا ہر جگہ — تھی مکاں سے لامکاں تک انکی سرحدِ وطن

آئے تھے دُنیا میں وہ دنیا پہ چھانے کے لئے
اک پیامِ عام لائے تھے زمانے کے لئے

تذکرے اقوامِ سابق کے سُنے ہیں جس قدر — تبصرہ اُن کا اگر کیجیے بہ امعانِ نظر
حال انکی زندگی کا صاف ہو جائے عیاں — تھے قواعد اور ضوابط اُن کے اکثر مختصر
انکی تبلیغ و اشاعت تھی فقط اپنوں ہی تک — تھا مُضائرہ اور اجانب میں کہاں انکا گذر
یہ خصوصیت تو اس خیر الامم ہی کو ملی — جس کے اثباتِ خلافت سے ہوا ہر خشک تر
جس کا فرضِ اوّلیں ابلاغ تعلیمات تھا — ہر زمیں پر جو پہونچ جاتی تھی بے خوف و خطر
جو خلافت شرحِ اِنّی جَاعِلٌ فِی الاَرضِ ہے — مستحق بن کر اُسے ثابت کیا مخلوق پر
سُن کو حکم لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی — محنت و کاوش کو سمجھا وجہِ اعزازِ بشر
عیش و عشرت سے بھی زیادہ سعی و محنت کا تھا شوق — خرمنِ عقبیٰ کو جانا کشتِ دُنیا کا ثمر
قالبِ ظاہر سے بڑھ کر قلبِ باطن کی تھی فکر — دل پہ وہ سکہ جمانے تھے بجائے سیم و زر
ساز و سامانِ معیشت ساتھ کچھ رکھتے نہ تھے — کیونکہ وہ ہر سرزمیں کو جانتے تھے اپنا گھر
جس زمیں پر بچھ گیا بستر بنی وہ آسماں — خاکساری سرفرازی میں تھی ان کی مستتر

مِٹتے مِٹتے بھی ہیں قائم یادگاریں آج تک
گلشنِ عالم میں ہیں انکی بہاریں آج تک

یہ وقائع ہیں دعویٰ کچھ نہیں اس میں کلام — جنکی تصدیقوں سے ہیں معمور تاریخیں تمام
قابلِ تسلیم ہوتا کیوں نہ ہر حسنِ عمل — ان کی طرزِ زندگی کا تھا مکمل اک نظام
اس معیشت اس تمدن سے جو ہے دُنیا میں آج — نابلد اُس وقت تھا گو خطۂ بیت الحرام

ہو چکا تھا لیکن ایسا انضباطِ کلیات — جن میں ہو سکتا تھا جزئیات کا بھی اہتمام
وہ جو تھے آزاد زندانِ سیاسیات سے — اور تھا خانہ بدوشوں کی طرح جن کا قیام
ہو گئے محصور جب کشور ستانی کے لئے — اور لی ہاتھوں میں اپنے جب حکومت کی زمام
پھر نہ وہ خانہ بدوشی تھی نہ خانہ جنگیاں — باتوں باتوں میں کیا بد نظمیوں کا انتظام
علم و حکمت کے خزانے تھے جو پنہاں جا بہ جا — کر دیا ان کو ہمیشہ کے لئے وقفِ انام
اُن کی تعلیمِ عمومی سے نہیں وہ منطبق — عہدِ حاضر میں جسے کہتے تھے سب تعلیمِ عام
فی الحقیقت یہ عمومیت برائے نام ہے — ہے نصابِ انتخابی میں خصوصی التزام
تھی وہ تعلیمِ عمومی حدِّ شخصیت سے دُور — مستحقِ فیضِ یکساں جس میں تھے شاہ و غلام

فیض تھا اس عہد کا مانندِ دریائے رواں
جس سے تھے سیراب سب بے امتیازِ این و آں

کیا پسندیدہ ہوں وہ آداب و اخلاقِ ملل — جن میں ہو ذاتی ضرورت کیلئے ردّ و بدل
ہے محالِ عادتہ تغیرِ خلق اللہ کی — حیف ہے ان پر جو ڈالیں دینِ فطرت میں خلل
حق کو باطل اور باطل کو وہی سمجھے گا حق — دست و پائے عقل و ایماں ہو گئے ہوں جسکے شل
سچ ہمیشہ سچ رہے گا، جھوٹ یکسر جھوٹ ہے — راستی و صدق سے کیا نسبت مکر و دغل
از روئے تقسیم ہیں دو صورتیں تعلیم کی — اک بہ اقرارِ لسانی اک بہ تصدیقِ عمل
دونوں تعلیموں میں ہے فرقِ زمین و آسماں — فرشِ خاک اسکی جگہ ہے، عرشِ پاک اسکا محل
مدعی ہیں آج قولِ بے عمل کے بے شمار — اور علمِ با عمل باقی رہا ہے فی المثل
مادی تعلیم کے سامان سب موجود ہیں — علمِ روحانی کے ہیں مفقود اسباب و علل
قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا یہ معمول تھا — کہتے تھے جو کچھ کیا کرتے تھے بے لیت و لعل
تھے مواخات و مساوات انکے درسِ اوّلیں — صورتِ شیر و شکر تھے اہلِ فقر اہلِ دول
رازِ خلوت تھا نہ کوئی سازِ جلوت سے جدا — حاضر و غائب نہ بھولے وہ کبھی عہدِ ازل

ان محاسن پر خوش ان سے مادرِ گیتی رہی
وہ رہے جس وقت تک پھولی پھلی کھلتی رہی

چشمِ بد دور آج اپنا ہی کروڑوں تک شمار   اور چودہ سو برس سے ہے عیاں دینی وقار
بانیٔ مذہب کے ارشادات سب محفوظ ہیں   اور بحمد اللہ ازبر ہے کلامِ کردگار
جمع اخبار و سیر کا بھی ہوا ہی حرف حرف   ہیں ذرائع اپنی معلومات کے سب آشکار
ہے مگر قہرِ خداوندی کہ ہم سے دور ہیں   اتحاد و اعتماد و اعتبار و اقتدار
جبکہ تھے اسلاف بے بہرہ کتابی علم سے   جبکہ آتے تھے نہ اُن کو آجکل کے کاروبار
جبکہ انکے اسلحہ تھے تیر و گوپال و کمند   جبکہ ان کے مرکبوں میں تھے ابل، خچر حمار
جبکہ حسبِ قولِ فردوسی مہذّب تھے نہ وہ   جبکہ کھانے پیتے تھے شیر و شتر یا سوسمار
اس زمانے کا کمال انکا یہ تھا باوصفِ نقص   جس عمل کا عزم کرتے تھے وہ ہوتا استوار
تا سو برس میں جس قدر وہ ہو چکے تھے کامراں   آج تیرہ سو برس میں ہم نہیں ہیں کامگار
سوچئے! اسباب انکی فتحمندی کے تھے کیا   اور پسپائی ہماری کس لئے ہے وجہ عار
شورشِ افہام و تفہیم اس زمانے میں نہ تھی   متحد ہونے کو بس تھی یا اخانا کی پکار

تھے مسلماں جبتلک اس حبل المتیں کے حلقہ بند
سب نے دیکھا انکو میدانِ عمل میں فتحمند

اک زمانہ تھا کہ ہوتے تھے ایسے واقعات   جنکے باعث ہم کہے جاتے تھے فخرِ کائنات
اک زمانہ ہے کہ ہم ہیں ننگِ عالم کیلئے   قابلِ صد عار ہے ایک ایک اپنی واردات
یاد آیا ہے کہ ہم تھے ربعِ مسکوں پر محیط   حلقۂ تعلیم تھا اپنا حصارِ شش جہات
بصرہ و بغداد و مصر و اصفہان و کاشغر   اندلس و شیراز و نیشاپور و بیروت و ہرات
یہ اور ایسے سیکڑوں اقصائے عالم کے بلاد   مرکزِ علمی تھے بہرِ طالبین و طالبات
انتظام اُن درسگاہوں کا تھا اپنے ہاتھ میں   ہونے پاتا تھا نہ جن میں اختلافِ ذاتیات

ہر تنزل کی ترقی کی طرف پرواز ہے یعنی انجام خرابی خوبیِ آغاز ہے
رات دن سب دیکھتے ہیں دورِ مہر و ماہ کا منتقل کشف و حجاب اُن کا بہ یک انداز ہے
اس تغیر سے ہے احساس ترقی کو نمو یہ طلوع اور یہ غروب اللہ کا اک راز ہے
یہ وہ پردہ ہے کہ جس میں سرِ قدرت ہے نہاں اس حقیقت میں ظہورِ صنعتِ ایجاز ہے
تا قیامت یہ نظامِ دہر مٹ سکتا نہیں صانعِ قدرت کا مستحکم ہر اک پرداز ہے
اس تنزل سے یہ ظاہر ہے کہ دورِ چرخ میں سرفگندہ آج جو ہے کل وہ سرافراز ہے
کوئی جز ذاتِ احد یکتا نہیں یکساں نہیں یہ اُسی کا حقِ فائق ہے جو بے انباز ہے
اس کے دامن سے ہیں وابستہ ہماری عزتیں بس اُسی کے دم سے باقی ہے جو کچھ اعزاز ہے
ہے ثباتِ عزم اگر ہم میں تو اس کے سامنے عارضی ہے یہ تغیر جو خلل انداز ہے

تھام لو گرتی ہوئی بنیادِ قومی تھام لو
یہ لبِ احسن پہ گویا غیب کی آواز ہے

خمسہ بر غزلِ داغ

اس کی ہر بات میں یک رنگی و یکتائی ہے انتہا یہ کہ بُرائی میں بھی اچھائی ہے
جانتے ہم ہیں، اسے ہم سے شناسائی ہے داغ ہر چند جہاں گرد ہے سودائی ہے
آپ کے سر کی قسم آپ کا شیدائی ہے

کبھی مسجد میں دُعا کی، کبھی کی خدمتِ دیر مگر افسوس کہیں کچھ نہ ہوا حاصلِ سیر
ہو گیا خوبیِ تقدیر سے سر باعثِ خیر صورتِ وصل نہ تھی کوئی بجز رنجشِ غیر
وہ جو بگڑے ہوئے آئے ہیں تو بن آئی ہے

عمر بھر یاد رہے گا یہ مآلِ بے داد خوب پائی ستم ایجاد نے بیداد کی داد
حسرتِ دید کی اب ختم نہ ہو کیوں روداد اور کیا خاک ملے گی دلِ بسمل کی مراد

جو تماشا ہے جہاں کا وہ تماشائی ہے

اُن سے کی جائے جو اُمیدِ شفا بے جا ہے
کہ طبیبوں کی دواؤں میں ہرا ہی کیا ہے
اپنی مرضی کے موافق یہ علاج اچھا ہے
جب کبھی بیٹھے بٹھائے خفقانؔ اچھلا ہے

ہم نے جا کر اسی کوچے کی ہوا کھائی ہے

جانتے ہیں کہ نہیں راحتِ جاں زحمتِ عشق
پھر بھی دل سے نہیں ہوتی ہے جدا حسرتِ عشق
کیا بتائے کوئی اصلیت و ماہیتِ عشق
نہیں معلوم کہ ہے کون بلا حضرتِ عشق

یوں تو اپنی بھی زمانے سے شناسائی ہے

نہ سہی عہدِ جوانی کے جو دن رات نہیں
احسنؔ انساں ہے فرشتہ نہیں جنات نہیں
ذکرِ ماضی ہو اگر کچھ تو بری بات نہیں
داغؔ گو اب کسی گلرو سے ملاقات نہیں

ہم نے برسوں اسی گلشن کی ہوا کھائی ہے

شاعری کی حقیقت

الا یا ایہا الشاعر، سنا وہ نظم روح افزا
کہ پائیں جس میں کیفیت مثالِ نشۂ صہبا
تکلم شعر کا ہو ہم نوائے قلقلِ مینا
بنے دروازۂ میخانہ ہر اک مصرعِ زیبا

صدائے شورِ خوانی سربسر رندوں کی ہو حق ہو
مخالف میکدے سے محفلِ معنی نہ مطلق ہو

نشست اسطرح لفظوں کی ہو جیسے مجمعِ رنداں
دوائر حرفوں کے مانند جام و شیشۂ دفنجاں
جو کاغذ قابلِ صافی تو نقطے کاگ کے شایاں
مدد یا ساقیِ کوثر! مہیا ہو یہ سب ساماں

مزہ آئے شرابِ کہنہ کا اس تازہ پانی میں
چلائیں کشتیٔ مے ہم طبیعت کی روانی میں

شرابِ کہنہ کیا! یعنی پرانی شاعری جس پر
نئی تہذیب والے معترض ہوتے ہیں یہ کہکر

گُل و بُلبل کے افسانے وصال و ہجر کے دفتر — ہوئے بوسیدہ و پارینہ ان کو چھوڑ دو یکسر
بقصدِ تکرار کیوں بے کار یہ اذکار پیہم ہیں
نیا منظر، نئی باتیں، نئے مضمون کیا کم ہیں

یہ کہنا ایک حد تک تو جوانوں کا بہت سچ ہے — قدیم اشعار میں آخر کی بھرتی کھچا کھچ ہے
اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے بیکار انکا پیچ ہے — نہیں جو قابلِ تسلیم کیوں اس بات کی اینچ ہے
بعینہ بس یہی حالت ہے تکرارِ خیالی میں
مویشی منھ چلایا کرتے ہیں جیسے جگالی میں

مگر با ایں ہمہ بے کار یہ فن ہو نہیں سکتا — لگا گر آنکھ اس سے کوئی غافل ہو نہیں سکتا
شناورِ قلزمِ معنی کا پتھر ڈھو نہیں سکتا — اگر چاہے تو شاعر وقت اپنا کھو نہیں سکتا
ہر اک رنگِ سخن مجموعۂ نیرنگ مضموں ہے
مذاقِ شعر بے شک نعمتِ خلاقِ بیچوں ہے

سنیں سب اب شاعری کیا چیز ہے کیا کرتی دھرتی ہے — یہ اسکا کام ہے کوزے میں اک دریا کو بھرتی ہے
جو شے آتی ہے اسکے قبضے میں وہ کب بکھرتی ہے — کہ ساری منتشر چیزوں میں پیدا میل کرتی ہے
نتیجے میل کے جو کچھ بھی ہوتے ہیں وہ ظاہر ہیں
سمجھتے ہیں حقیقت خوب اسکے بجلنے ماہر ہیں

یہ ہے فن لطیف، اک ذی خرد نقاش کی صورت — چھپاتی ہے انھیں چیزوں کو جو ہوتی ہیں بدہیئت
بُری ہے جو نظر میں ہے انھیں سے دل کو بھی نفرت — جبھی تو شاعری سے ہوتی ہے مانوس اک خلقت
نہ کیونکر شاہدِ معنی ہو یکتا حسن صورت میں
نہاں اک نور کا پتلا ہے شاعر کی طبیعت میں

کمندِ شاعری کو فکر کیا ہے گر بلندی ہے — کہ اس کی پستیٔ مضموں میں سر بلندی ہے
زوالِ شاعری یہ ہے کہ پستی ہر بلندی ہے — کمالِ شاعری یہ ہے بلندی سر بلندی ہے

وہی شاعر ہے جو اک رائی کو پربت بناتا ہے
مجازی صورتیں رنگِ حقیقت میں دکھاتا ہے

مجاز اور استعارے سے عبث کوئی بھڑکتا ہے
کوئی کانٹا نہیں تشبیہ، ناحق دل کھٹکتا ہے
اگر راہِ عدم بھی ہو تو کب رہ رہ کے بھٹکتا ہے
ہمیں کیفِ سخن آتا ہے ناصح کیوں بہکتا ہے

مزا ملتا ہے ان باتوں میں انکو جو سخن ور ہیں
مرصع کاریاں سب شاہدِ معنی کا زیور ہیں

خلافِ فطرت ان باتوں کا کہنا نامناسب ہے
کہ یہ فن منتقد ہے اس کا ماہر ذی مناسب ہے
عطیہ ہے یہ وہبی، قدرتی ہر ایک کا سب ہے
کہے گا تذ زاید وہ نہ اس کو جو محاسب ہے

ہماری شاعری فعلِ عبث ہو، ہو نہیں سکتی
بدی کا بیخ گلزارِ سخن میں بو نہیں سکتی

خدا نے آدمی کو اصل میں پیدا کیا عریاں
طریقِ سترپوشی سے بھی تھا واقف نہ وہ ناداں
ہوئے عقل و خرد سے جب مکمل حضرتِ انساں
تو ٹوپی کرتہ، پاجامہ، سبھی کچھ بن گیا ساماں

یہ ساماں جو بنایا ہے بگاڑا جا نہیں سکتا
نہ ہو جب تک لباس گرم جاڑا جا نہیں سکتا

یہی سب رنگ ہیں تشبیہ ہیں اور استعارے ہیں
انھیں سے دلکشی ہے حسنِ معنی کے نظارے ہیں
صراحت کا مزا ہے، ہر کنائے ہر اشارے میں
غرض جو کچھ کہا کم ہے وہ اس صنعت کے بارے میں

تقشع سے تنفر سادہ لوحی کی نشانی ہے
کہ صانعِ ازل اس طرز کا بانی مبانی ہے

مگر ہاں وہ تصنع ہے جو ہم معنائے مکاری
بلاشک قابلِ نفرت ہے چھوڑو لغو گفتاری
یہ بیہودہ سرائی ختم ہونی چاہیئے ساری
اسی پر غیر ہنستے ہیں یہی ہے باعثِ خواری

لباس اچھا پہننا چاہیئے ہر ذی وجاہت کو

بناؤ سانگ بھر کر تم نہ اصلی شکل و صورت کو

بہت افراط و تفریط ان دنوں ہر ہر طرف ظاہر — اب انہیں ایشیائی ہوں کہ وہ ہوں نیچرل شاعر
نہ باتیں انکی سب بد تر نہ اقوال انکے سب نادر — کہیں مجبور ہے کوئی کہیں کوئی نہیں قاصر

جو باتیں صاف سچی ہوں انھیں کیا کوئی جھٹلائے
یہ ناممکن کہ خاک اُڑنے سے نور مہر چھپ جائے

بُری وہ سادگی جسمیں ہو شانِ جامہ عریانی — وہ کیا گلکاریاں جنمیں ہو گندی طرافشانی
نہ بہتر وہ کمی حد کی، نہ اچھی یہ فراوانی — مگر ہے اعتدال ایسا نہیں جسکا کہیں ثانی

روش اچھی ہے یہ سب کا یہی دستور ہو جائے
دعا ہے سعیِ احسنؔ یا خدا مشکور ہو جائے

مرثیۂ داغؔ[1]

میری وہ دُکھ بھری کہانی ہے — جس کو پتھر بھی سُن کے پانی ہے
بات کرنی محال ہے گویا — کس میں اب طاقتِ لسانی ہے
ہو گیا دل کباب جل بھُن کر — یہ تپِ سوزشِ نہانی ہے
آج ٹوٹا ہے مجھ پہ غم کا پہاڑ — اور کیا وجہ سرگرانی ہے
ہائے کیا بند ہے یہ رقت کا — عید کے روز نوحہ خوانی ہے
کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا — کچھ عجب دورِ آسمانی ہے
تھے جہاں میزبان عیش و نشاط — اب وہاں غم کی میہمانی ہے
بے حلاوت ہے عیش دُنیا کا — ہائے کیا تلخ زندگانی ہے

[1] یہ مرثیہ مثنوی کی بحر میں ہے۔ مولانا کے کلام سے دوسرے اصناف سخن کے نمونے تو کچھ چکا ہوں، مثنوی کا نمونہ یہ مرثیہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

سو برس تک جیے تو کیا حاصل　　آخر اک روز موت آنی ہے
ملک الموت کے لئے یکساں　　پیری و طفلی و جوانی ہے
نہ رہا ہے یہاں نہ کوئی رہے　　سچ ہے دُنیا سرائے فانی ہے

کیا کسی کو خبر ہو دم بھر کی
کہ ہوا پر بنا ہے اس گھر کی

بے ثباتی جہان کی دیکھی　　کچھ نہ خیر اپنی جان کی دیکھی
ہے سرائے جہاں عجیب جگہ　　طرزِ نو اس مکان کی نہ دیکھی
کوئی جی بھر کے رہ نہیں سکتا　　رسم یہ اس جہان کی دیکھی
شکل بے مہریٔ فلک کے سوا　　نہ کسی مہربان کی دیکھی
ہائے دو بھر ہے چار دن رکھنا　　ہمّت اس میزبان کی دیکھی
چال سیدھی کبھی نہیں چلتا　　کج روی آسمان کی دیکھی
آ گیا وقت موت کا جس دم　　پھر نہ مہلت اک آن کی دیکھی
زیر ہو، دیو مرگ، یہ طاقت　　نہ کسی پہلوان کی دیکھی
عقل سمجھے نہ اُس کی باتوں کو　　نہ رسائی گمان کی دیکھی
ہم نے لاش آج بے نشاں ہو کے　　ایک عالی نشان کی دیکھی
نہ رہا میرِ لشکرِ اُردو　　یہ تباہی زبان کی دیکھی

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ نظم بے چراغ ہوا

ہیں عزیزانِ خواجہ ناشؔ کدھر　　کیا ابھی تک انھیں نہیں یہ خبر
سائل و خلق و بارق و ناداں　　رنج و آزار و وارث و اختر
واصفی و عزیز، طیش و خیال　　نوح و آہ و مبارک و انور

بے خود و اشک و حسرت و بے باک — برق و فوق و متین و عشق و شرر
حسن و عیش و جالب و اقبال — شاعر و شوخ و فاخر و گوہر
شرق و عالم و انیق و دلبر — باغ و توقیر و قہر و نجم و قمر
الم و شاہی و رسا و ضیار — شمس و محفوظ و ثاقب و احقر
بسمل و حیرت و نسیم و ذبیح — صبر و شوق و عدل، بشیر و بشر
وجد و افسوں و جادو و بیدار — ہجر و احسان و رحمت و افسر
رشک و زار و وجاہت و بیتاب — انجم و ثابت و جلال و اثر
آئیں اور آکے اس طرح سب لوگ — روئیں احسن کے ساتھ مل جل کر

خارِ حسرت بیان سے نکلے
دل کا کانٹا زبان سے نکلے

تھا جو ہندوستان کا بلبل — پڑ گیا اس پہ موت کا چنگل
جسکی باتوں سے پھول جھڑتے تھے — ہائے اسکا چراغ آج ہے گل
گلِ مضموں تھے جسکے دل میں بھرے — اسکی تربت ہے زیرِ چادرِ گل
شہرہ تھا جس کی نغمہ سنجی کا — اس کے ماتم کا ہر طرف ہے غل
پیہم اس طرح شورِ ماتم ہے — شیشۂ مے کی جس طرح قلقل
شاعری کا لطیف رنگ گیا — ہو گیا آج خاتمہ بالکل
تھے وہ اس کے تصور و تخیل — بے پیئے تھا خمار و نشہ کل
صاف سچی سی بات کہتا تھا — اس نے باندھے کبھی نہ جھوٹے پل
داد دی شعر جس سے تھی روشن — داغ اب دے گیا وہ شمعِ سُبل
فاتحہ خواں رہا جو اور دل کا — ہائے آج اس کا ہو رہا ہے قُل
تھی خبر یوں نہ اس کے مرنے کی — موت بے وقت دے گئی یہ جل

دے دیا رنج اک خدائی کا
ستیاناس ہو جدائی کا

اُس کی رہ رہ کر آرہی ہے یاد
بھولتا ہی نہیں دلِ ناشاد

صورت آنکھوں میں اسکی پھرتی ہے
ہائے کیا شخص تھا وہ پاک نژاد

کوئی اُستاد اب کہاں ایسا
دل سے قائل ہوں جسکے سب جاد

کھینچتا تھا وہ یوں خیالی شکل
جس طرح نقش ظاہری بہزاد

وہ نوا سنجیاں وہ بات کہاں
اب تو نغمہ ہے صورتِ فریاد

گلشن اُردو کا ہو گیا پُر خار
زاغ و بوم کو مبارک باد

ہوئی ترکی تمام اردو کی
بے طرح یہ چمن ہوا برباد

کوئی اس کا نگاہباں نہ رہا
سرو شمشاد ہو گئے آزاد

نہ ہوئی ہے نہ ہو کسی کو نصیب
سر کھپائیں ہزار زشت نہاد

کون کھوٹے کھرے کو پرکھے گا
کوئی ٹکسال کا نہیں نقّاد

فرد تھا کائنات میں بس وہ
ایک تھا اپنی بات میں بس وہ

کوئی ایسا دکھائیے تو سہی
داغ ثانی بتائیے تو سہی

محض لفاظیاں نہ مانوں گا
لکھ کر ایسا سنائیے تو سہی

جو مٹائے نہ مٹ سکے دل سے
سکّہ ایسا بٹھائیے تو سہی

چاہیئے جس جگہ سے پڑھ لیجئے
اُس کا دیوان لائیے تو سہی

لو فرضنا! وہ تھا بڑا جاہل
اور ایسا بلائیے تو سہی

ہم بھی دیکھیں وہ تابر عالم
نام دو اِک گِنائیے تو سہی

دوسروں سے مقابلہ کر کے
خفتیں کچھ اُٹھائیے تو سہی

آنکھ ہم سے ملائیے تو سہی　　چلیے بس ہو چکے بہت دعوے
اپنی صورت بنائیے تو سہی　　آپ اور اس کی ہمسری توبہ
یاد اُس کی بھلائیے تو سہی　　بھول سکتا نہیں اسے کوئی
داغ کو اب مٹائیے تو سہی　　حشر تک اس کا نام چمکے گا

کون اس کو مٹانے والا ہے
اس کی باتوں کا بول بالا ہے

نام روشن کیا ہے کیا تو نے　　داغ! سکّہ بٹھا لیا تو نے
اب جو ہے یہ دیا مزا تو نے　　پہلے تھا بے نمک مذاقِ سخن
وہ بڑھائیں بدرجہا تو نے　　نظم میں جو لطافتیں کہ نہ تھیں
اس کو دی ہے مگر جلا تو نے　　تھا نہ صاف آئینہ معانی کا
رستہ اپنا جدا کیا تو نے　　اک طریقے پہ تھی روش سب کی
نقشہ کھینچا مگر نیا تو نے　　سب کے سب تھے لکیر کے ہی فقیر
پا لیا یہ لقب بجا تو نے　　تو ہی دراصل تھا جہاں اُستاد
افصح اک ملک کو کیا تو نے　　تھا حقیقت میں تو فصیح الملک
ناظم یار جنگ کا تو نے　　لشکرِ نظم سے خطاب لیا
اصل یہ ہے، جو ہے کہا تو نے　　گرچہ آصف ہے معطی الالقاب
جو دیا اے خدا دیا تو نے　　داغ کو کون دینے والا تھا

آج فخرِ زمانہ کوئی نہیں
اپنے فن میں یگانہ کوئی نہیں

بن گئے نقش لوحِ تُربت کے　　دل میں مضمون یاس و حسرت کے
جس کے الفاظ ہیں قیامت کے　　ہے یہ پُر درد مطلعِ اُستاد

دیکھ کر کل تک اس کو ٹھنڈک تھی   آج ہیں داغ سوزِ فرقت کے
جیتے جی جائے گا نہ یہ صدمہ   حشر تک دن ہیں اس مصیبت کے
ہو نہ چکے۔ ہیں بھی، اور ہونگے بھی   مگر اس طرح کی طبیعت کے
نہ ہوئے ہیں، نہ ہوں، نہ ہیں شاعر   جن میں ہوں وصف جامعیت کے
میر و سودا کی طرز تھی اس میں   ڈھنگ تھے سوز و درد و جرأت کے
چھوٹتا کیا مذاقِ ذوق اس سے   کہ مزے تھے اُسی کی لذت کے
اکثر انداز غالب و مومن   تھے مگر اپنی اپنی رنگت کے
باغ عالم میں ڈھونڈھتے کیا ہو   ہیں کرشمے یہ دستِ قدرت کے
داغ سا دوسرا نہ پاؤ گے   گُل ہزاروں ہیں ایک صورت کے

جلوہ اس کا نظر نہیں آتا
نہیں آتا نظر نہیں آتا

مر گیا وہ سُخن ورِ دہلی   تھا جو دل سے ثنا گرِ دہلی
تھا وطن گرچہ آنکھ سے اوجھل   دل میں تھا اُس کے منظرِ دہلی
داغ کی وجہ سے زمانے میں   خوب چمکا مُقدرِ دہلی
دُور دُور اس کی روشنی پہنچی   داغ تھا یا کہ خاورِ دہلی
آسماں تھی زمین دِلّی کی   تھا وہ ماہِ منوّرِ دہلی
جس سے واقف ہو بچّہ بچّہ تک   کون ایسا ہے اشہرِ دہلی
کون ایسا ہے شاہِ مُلکِ سُخن   تھا وہی فخرِ کشورِ دہلی
عمر بھر گرچہ وہ رہا باہر   تھا مزاج اس کا خوگرِ دہلی
ہے زمینِ دکن بھی قابلِ رشک   جو بنی کانِ جوہرِ دہلی
چھپ گیا داغ کُنجِ مرقد میں   ہے نگوں بخت اخترِ دہلی

جائے گا اب یہ رنج مشکل سے
ہم کو جینا پڑا مرے دل سے

کم سے کم مُطّلع تو کرنا تھا — اگر ایسا ہی تجھ کو مرنا تھا
ایک دُنیا پڑی تھی اس کیلئے — کیا تجھی پر اجل کا دھرنا تھا
زندگی تیری کس کو بھاری تھی — تجھ کو برسوں ابھی ٹھہرنا تھا
ہے جوانی پہ گرچہ حسنِ سخن — پھر بھی اس کو ابھی نکھرنا تھا
زیور و معنی و مضامیں سے — کچھ دنوں اور بھی سنورنا تھا
نقشِ معنی میں ہے کسر باقی — رنگ ابھی اور اس میں بھرنا تھا
سلکِ نظم اور اس طرح ٹوٹے — نامناسب ابھی بکھرنا تھا
ہیں جو بحرِ سخن میں غرق ابھی — تیرے ہاتھوں انھیں اُبھرنا تھا
گو سشتۂ قبر میں قدم اپنا — جلد اتنا نہ تجھ کو دھرنا تھا
داغ دہاں سرائے دُنیا میں — اور چندے قیام کرنا تھا
لیکن افسوس کیا چلے تدبیر — واقعہ یہ یوں ہی گزرنا تھا

زورِ قسمت سے چل نہیں سکتا
دل سنبھالے سنبھل نہیں سکتا

اُس نے وہ طبع نیک تھی پائی — نہ کبھی جس میں کچھ بدی آئی
نہ کسی سے عناد تھا اس کو — نہ بنا وہ کبھی تبرّائی
اُس کو بھائی تھی راستی ایسی — دشمنوں سے بھی کی نہ کج رائی
کیا بہم تھی کٹا چھنی پہلے — کوئی میری تھا کوئی سودائی
آتشی، ناسخی کوئی بنتا — مصحفی کوئی، کوئی انشائی
الغرض شاعری میں اگلوں نے — خوب آپس میں کی صف آرائی

اس نے اپنے معاصروں میں مگر
رشک کی آگ تک نہ بھڑکائی

ہجو لکھی نہ اس نے کوئی کبھی
گرچہ گالی جہان کی کھائی

اس کے ہم عصر اور ہم فن بھی
تھے جنابِ امیر مینائی

لیکن آپس میں یوں رہے مل کر
جیسے رکھتے ہوں میل دو بھائی

جس نے دیکھی ہے اس نے دیکھی ہے
دونوں کی دوستی و یکجائی

ہجو کی رسم اُٹھا گئے دونوں
اپنی الفت دکھا گئے دونوں

داغ اور امیر کی اُلفت
پا گئی اک جہان میں شہرت

مدتوں رام پور میں رہ کر
متفرق ہوئے نہ اک ساعت

تیس چالیس سال تک جن کی
اک جگہ ہو قیام کی صورت

اُن میں کیوں کر نہ اتحاد بڑھے
کس طرح آئے اُن میں غیریت

رہے آپس میں مثل شیر و شکر
تلخیٔ رشک سے رہی نفرت

جیتے جی جس طرح رہے دونوں
یونہی باہم رہے پسِ رحلت

ہے یہ سچی دلیل یک جہتی
ہے یہ نادر نتیجۂ خُلّت

چند دن کے لئے ہوئے تھے جُدا
حشر تک اب رہیں گے ہم صحبت

وائے اے سرزمین ملکِ دکن
تو نے پائی ہے خوب ہی قسمت

دہلی و لکھنؤ کے دو اختر
ہیں نہاں تجھ میں اے فلک رفعت

اُن کے دیدار کی تمنا ہے
کاش بر آئے اپنی یہ حسرت

پھر انھیں کوئی لائے گا کہ نہیں
کیا گیا وقت آئے گا کہ نہیں

موت پر کوئی بس نہیں چلتا
ہائے کچھ دسترس نہیں چلتا

بزمِ دنیا کا لطف کیا تنہا   کام بے چند کس نہیں چلتا
توسنِ عمر پہ چلے کیا زور   اس طرح یہ فرس نہیں چلتا
ٹوٹ جاتا ہے قید خانۂ روح   تا ابد یہ قفس نہیں چلتا
غلغلہ زندگی کا ہے چندے   کچھ بہت یہ جرس نہیں چلتا
جتنی مقدار ہے مقدر میں   اس سے بڑھ کر نفس نہیں چلتا
سانس جبتک ہے، ہے جبھی تک آس   رک گیا جب تو بس نہیں چلتا
پہلے چلتا ہو شاید اتنا دم   اب ہزاروں برس نہیں چلتا
مرنے جینے پہ کیوں ہو سوچ بچار   اس میں کچھ پیش و پس نہیں چلتا
کچھ بتا مرگ و زندگانی کا   سچ ہے اے دادرس نہیں چلتا
چاہ عمرِ دراز کی ہے عبث   اس میں دخلِ ہوس نہیں چلتا

گر مرض ہو دوا کرے کوئی
مرنے والے کا کیا کرے کوئی

الوداع اے کمالِ شعر و سخن   الفراق اے خیالِ خواہشِ من
کون مضمونِ زلف و لب باندھے   کہ طبیعت کو ہے نئی الجھن
اب نہ وہ دل رہا، نہ ہی وہ امنگ   نہ وہ بلبل ہے آہ اب نہ چمن
تازگی باغِ شعر میں ہو کہاں   خشک وہ ہے ہرا بھرا گلشن
شعر گوئی تھی بات معمولی   اب ہمیں ہو گئی وہ راہ کٹھن
کیوں نہ یہ راہ ہو کٹھن ہم کو   نہیں استاد رہنمائے زمن
کون رستا بتانے والا تھا   رہنما اب ہیں صورتِ رہزن
گرچہ اوروں کے سامنے اب بھی   نہ جھکے گی کسی طرح گردن
پھر بھی استاد کی ضرورت تھی   جانتے جس کی بات ہم ملکا

کون ہے اب سر ہمارے لئے　　کس کے سائے میں ہم رہیں ایمن
ہائے دشمن کو بھی یہ داغ نہ ہو　　کیا بُرا وقت وہ بھی تھا احسن
کہ بتاریخ گفت ایں ناشاد
زجہاں رفت آنجہاں اُستاد
۱۳　　ھ　　۲۲

غمِ شبلی اور ماتمِ حالی[1]

رخصت اے صبر اکہ بس جبر کی آب تاب نہیں　　طمعِ عیش نہیں آرزوئے خواب نہیں
جمع کیا کیا غم واندوہ کے اسباب نہیں　　دل مضطر نہیں یا دیدۂ خونناب نہیں
خانۂ عیش میں بربادی و ویرانی ہے
آج مجموعۂ خاطر کی پریشانی ہے
عقل واورا ک ہیں گم جمع نہیں ہوش و حواس　　وحشت اُٹھتی ہے جو بیٹھے کوئی غمخوار کے پاس
دلِ مایوس پہ ہیں قبضہ کئے خوف و ہراس　　کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے بجز حسرت و یاس
خاک اب وہ کے زمانے میں کوئی سیر کرے
کہ بُرے دن نظر آتے ہیں خدا خیر کرے
کوئی سامان فراغت نہیں حسبِ دلخواہ　　گھر ہے ویران تو گھر والے ہیں برباد و تباہ
اس طرف ملک میں ہے قحط دو یا شام و پگاہ　　اس طرف قوم میں نقدانِ کمال آہ صد آہ
جب سے خوش بختی و اقبال نے منہ پھیرا ہے
ہر طرف سے غم و ادبار نے آگھیرا ہے

[1] ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی اور مولانا حالی نے وفات پائی تو مولانا احسن مارہروی ان دونوں موتوں سے اسقدر متاثر ہوئے کہ غم شبلی اور ماتم حالی میں ایک مرثیہ کہہ ڈالا۔ کسوف النیّرین کے نام سے یہ مرثیہ ایک طویل مقدمہ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شایع ہوا۔

آج سے چند صدی قبل کے سنیئے حالت — نہ یہ ادبار کا نقشہ تھا نہ غم کی صورت
کال تھا رنج کا تھی عیش کی بڑھتی دولت — اور پھر علم و کمالات کی شان و شوکت
کوئی مفلس نظر آتا تھا نہ جاہل کوئی
تھا نہ اس عہد کا بے فکر بھی کاہل کوئی

اصفہان و عربستاں کا ہو کیا ذکر یہاں — کہ پسندیدہ و مرغوب نہیں طولِ بیاں
خطۂ ہند جسے کہتے ہیں فردوس نشاں — اسکے حالات ہی سنیئے تو یہ ہو جائے عیاں
رات دن بام ترقی پہ چڑھے رہتے تھے
کیا زمانہ تھا کہ ہم سب سے بڑھے رہتے تھے

اولیاء و صلحاء و عرفاء و اُمرا — فقہاء و علماء و فضلا و وزرا
حکما و فصحاء و بلغاء و شعرا — اتقیاء و کملا و رؤسا و فقرا
یہ لقب اور ان کے سوا پیشہ ور اہلِ ہنر
ملک میں پھیلے تھے یوں جیسے فلک پہ اختر

فارغ البال تھے اس عہد میں سب اہلِ کمال — آب خور کی نہ گرانی تھی نہ تھا قحط رجال
جسکو دیکھو نظر آتا تھا نہایت خوشحال — عیش و عشرت کے سوا پاس نہ تھا رنج و ملال
باکمالوں کی یہ کثرت تھی زمانے بھر میں
جمع ہو جاتے تھے دس دس کبھی اک اک گھر میں

اس تعین کو سمجھیے نہ غلو شاعر — بے تکلف اسے مانیں گے جو ہونگے ماہر
واقعاتِ متواتر سے ہوں کیوں کر منکر — دیکھ سکتے ہیں تواریخ کو اب بھی ناظر
اک صدی میں کملاءؔ و فضلاء تھے جتنے
عمر بھر اب نظر آئیں گے نہ یکجا اتنے

اکبری عہد کی تاریخ ہی دیکھیں ہم اگر — سیکڑوں آئیں نظر اہلِ کمال اہلِ ہنر

جن کا اسوقت میں ثانی تھا نہ کوئی ہمسر فرد فرد اپنے کمالات میں تھے نام آور

دھوم تھی ہند سے ایران و عرب تک سب کی

جب تو جب عزت و توقیر ہو اب تک سب کی

جب ہوا عالم ایجاد میں اکبر پیدا جلوہ گر نوسو اُنچاس سنِ ہجری تھا

سو برس تک ہو جو اس سال سے حصر کملا ایک مجموعۂ طومار ہو فہرست ہو گیا

ڈالئے ذیل کے ناموں نظر بالاجمال

کہ فقط ایک صدی میں ہیں یہ اصحاب کمال

ملک بھر کے کملا کا تو ہے دشوار شمار ایک کوزے میں سماتا نہیں بحرِ زخار

ہے مناسب کہ نمونے کیلئے ہوں اظہار صرف وہ نام جو تھے زینتِ شاہی دربار

صورتِ ترجمہ اسلاف کی تحریریں ہیں

اکبر و عہد جہانگیر کی تصویریں ہیں

خانخاناں[1] و ابوالفضل[2] و ضمیری[3] و عرفی[4] دکنی خواجہ خداوند[5] و صبوحی[6] فیضی[7]

میرزا جعفر[8] و ہمام[9] و محمد یحیی[10] ملک قمی[11] و ملائے حسین نقشی[12]

میر فتح اللہ[13] شیرازی و قاضی کمال[14]

حاجی[15] افضل و مشکیں[16] رقم و شیخ جلال[17]

[1] عبدالرحیم خانخاناں المتوفی سنہ ۱۰۳۶ھ [2] علامہ ابوالفضل المتوفی سنہ ۱۰۱۱ھ [3] مولانا نظام الدین ضمیری بلگرامی المتوفی سنہ ۱۰۰۳ھ [4] مولانا جمال الدین عرفی المتوفی سنہ ۱۰۲۷ھ [5] خواجہ خداوند دکنی المتوفی سنہ ۹۹۵ھ [6] صبوحی المتوفی سنہ ۹۷۲ھ [7] ابوالفضل فیضی المتوفی سنہ ۱۰۰۴ھ [8] مرزا جعفر قزوینی المخاطب بہ آصف خاں المتوفی سنہ ۱۰۲۱ھ [9] مرزا ہمایوں المخاطب بہ حکیم ہمام المتوفی سنہ ۱۰۰۳ھ [10] محمد یحیی المتوفی سنہ ۹۹۹ھ [11] ملک قمی مشہور شاعر المتوفی سنہ ۱۰۲۵ھ [12] ملا حسین نقشی مہر کن المتوفی سنہ ۹۸۹ھ [13] میر فتح اللہ شیرازی المتوفی سنہ ۹۹۷ھ [14] قاضی ابوالفتح عرف قاضی کمال بلگرامی المتوفی سنہ ۱۰۰۱ھ [15] حاجی افضل بلگرامی المتوفی سنہ ۹۸۰ھ [16] میر عبداللہ ترمذی المخاطب بہ مشکین رقم المتوفی سنہ ۱۰۳۵ھ [17] شیخ جلال المتوفی سنہ ۹۸۹ھ -

طالب[18] آملی و شیخ سلیم[19] چشتی حافظ[20] رخنہ و نور اللہ[21] و قاسم[22] علوی[23]

نور دیں[24]، شیخ مبارک[25] شہ عارف[26] نامی شمس دیں[27] خان زماں[28] یوسف[29] و ملا طاری[30]

حضرت غوث[31] و ضیاء اللہ[32] و عبد القادر[33]

مشہدی[34]، کوکہ[35]، ابو الفتح[36]، رفیع شاعر[37]

بیگ خاں[38] تردی و شیخ احمد[39] الف ثانی شیخ عبد النبی[40] و شیخ گدائی[41] بخشی[42]

مرزا شاہ رخ[43] و عدل[44] و حکیم مصری[45] خان غازی[46] و معالی[47] و رفیع صفوی[48]

ناصر الملک[49] و علائی[50] و شہ عبد غفور[51]

مرتضی[52]، خان جہاں[53] خواجہ امین[54] منصور[55]

[18] ملک الشعراء طالب آملی المتوفی ۱۰۳۵ھ [19] حضرت شیخ سلیم چشتی المتوفی ۹۷۹ھ [20] حافظ رخنہ المتوفی ۱۰۰۰ھ [21] قاضی میر نور اللہ شوستری المتوفی ۱۰۱۹ھ [22] سید نجم الدین نام ابو القاسم کاہی تخلص المتوفی ۹۸۸ھ [23] شیخ وجیہ الدین گجراتی علوی المتوفی ۹۹۸ھ [24] حکیم نور الدین المتخلص بہ قراری المتوفی ۹۸۳ھ [25] مبارک اللہ عرف شیخ مبارک والد ابو الفضل فیضی ۱۰۰۱ھ [26] شاہ عارف حسینی المتوفی ۱۰۰۰ھ [27] حکیم الملک شمس الدین گیلانی المتوفی ۹۸۹ھ [28] امیر الامراء خان زماں علی قلی خاں سیستانی المتوفی ۹۷۵ھ [29] محمد یوسف درباری ۹۷۰ھ [30] ملا علی محدث طاری المتوفی ۹۸۱ھ [31] سید محمد غوث گوالیاری المتوفی ۹۷۰ھ [32] شیخ ضیاء اللہ متوفی ۹۳۰ھ [33] شیخ عبد القادر بدایونی المتوفی ۱۰۰۴ھ [34] مولانا غزالی مشہدی ۹۸۰ھ [35] مرزا عزیز کوکہ المخاطب اعظم خاں ۱۰۳۳ھ [36] حکیم ابو الفتح گیلانی برادر حکیم ہمام المتوفی ۹۹۷ھ [37] رفیع الدین دکنی ۱۰۱۰ھ [38] تردی بیگ خاں ترکستانی [39] شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ۱۰۳۵ھ [40] شیخ عبد النبی ۹۹۰ھ [41] شیخ گدائی کمبوہ ۹۷۶ھ [42] نظام الدین بخشی ۱۰۰۳ھ [43] مرزا شاہ رخ المتوفی ۱۰۱۶ھ [44] سید محمد میر عدل سنبھلی المتوفی ۹۸۶ھ [45] حکیم مصری دکنی [46] غازی خاں نظام بدخشی ۹۹۲ھ [47] شاہ ابو المعانی ۹۷۱ھ [48] سید رفیع الدین صفوی [49] ملا پیر محمد خاں [50] شیخ علائی ۹۵۶ھ [51] شاہ عبد الغفور عرف بابا کپور ۹۷۹ھ [52] میر مرتضی شریفی [53] حسین قلی خان خاناں [54] خواجہ امین الدین تبریزی ۹۸۲ھ [55] خواجہ منصور ۹۸۹ھ

اکثر ان میں ہیں وہی نام جو تھے درباری — جنکو اکبر سے عنایت ہوئی منصب داری
اہلِ دربار کی فہرست نہیں یہ ساری — سب گنے جائیں تو ہو جائے کتاب اک بھاری
ہے فقط اسم شماری یہ نمونے کے بطور[1]
ورنہ درباریوں کے نام ہیں باقی ابھی اور

رہ گئے سب ان میں تھے نام آور صاحب اقبال — بدر کامل کوئی تھا، کوئی تھا خورشید کمال
سب کے اوصاف کی تشریح ہو اک طول خیال — مختصر یہ ہو انھیں سے تھا سب اکبر کا جلال
شاہ گر ان میں نہ تھا کوئی تو حیرت کیا ہے
شاہ گر سب تھے تو پھر اور حقیقت کیا ہے

ایک دربار کی اک شہر کی یہ تھی حالت — ملک بھر کا ہو جو احصا تو یہ پہونچے کثرت
گننے والوں کو ہو گننے میں نہایت دقت — سیکڑوں کیا کہ ہزاروں پہ ہو انکی نوبت
اس سے اندازہ تعلیم سلف ہوتا ہے
جس سے لیتا ہے سبق وہ جو خلف ہوتا ہے

اک وہ تھا عہدِ قدیم ایک یہ ہے عصرِ جدید — جامۂ کہنہ کی یک لخت ہوئی قطع و برید
نہ وہ تعلیم و تعلم ہے نہ وہ گفت و شنید — ہے ہر اک رنگ ہر اک بات میں گویا تجدید
ایشیائی روش و طرز کے انداز نہیں
وہ ترانے نہیں وہ دھن نہیں وہ ساز نہیں

---

[1] مولانا نے یہاں ان ہندو کملا اور فضلا کا ذکر نہیں فرمایا جو دربار اکبری و جہانگیری سے وابستہ تھے، ایسے ہندو باکمالوں میں مفصلہ ذیل خاص شہرت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ دیگر خصوصیات کے اعتبار سے زیادہ مشہور تھے لیکن علم وکمال میں بھی انھیں دخل تھا۔
راجہ ٹوڈرمل۔ راجہ بیربل۔ راجہ مان سنگھ۔ گنگ کوی یعنی گنگا پرشاد۔ کرن۔ نرہری مہاپاتر۔ سورداس۔ تلسی داس وغیرہ وغیرہ۔

نہ وہ عالم نہ وہ علم اور نہ وہ شانِ تعلیم   نہ وہ مکتب نہ وہ حافظ نہ میاں جی نہ حکیم
نہ وہ شاعر نہ وہ اشعار نہ وہ طبعِ سلیم   مٹ گئیں صفحۂ عالم سے تصاویر قدیم
نہ وہ میخانہ ، نہ مے کش ہیں نہ وہ ساقی ہے
بس اک اللہ کا ہے نام کہ وہ باقی ہے

آ گئی ہم پہ یکایک یہ تباہی کیسی   روشنی میں نظر آتی ہے سیاہی کیسی
علم و دولت نے رفاقت یہ نباہی کیسی   ہوئی کایا پلٹ اپنی یہ الٰہی کیسی
سو برس پہلے جو حالت تھی وہ حالت نہ رہی
تیغ ہندی کی وہ بُرش وہ اصالت نہ رہی

کہتے ہیں سب کہ ترقی کا ہے اصلی یہی دَور   ہو گئی ہے روشِ کہنہ ہر اک قابلِ غور
پہلے انداز تھا اور اب وہ ہوا اور سے اَور   قابلِ وقعت و عزت نہیں پچھلا کوئی طور
مشرقی علم و ادب کو کوئی پڑھتا ہی نہیں
زینہ موجود ہے لیکن کوئی چڑھتا ہی نہیں

دیکھ لی ایک صدی کی یہ ترقی یہ بہار   اب ذرا ایک صدی کا ہو تنزل بھی شمار
تیرھویں پچھلی صدی میں جو بچے تھے دو چار   ہو گئے راہیِ فردوس مٹے سب آثار
نام اُن نامیوں کے آج سُنائیں کن کو
اجنبی لوگ نظر آتے ہیں دیکھو جن کو

یادگار ان کے جو دو شخص تھے فرخندہ خصال   ان کو بھی کھا گئی موت اُٹھ گئے وہ بھی امسال
وہ اُٹھے کیا ، ہوا خاتمۂ فضل و کمال   جانشیں ان کا ملے کوئی یہ ہے خام خیال
ہائے اک ساتھ گئے شبلی و حالی دونوں
کر گئے مے کدۂ علم کو خالی دونوں

تھے یہ دونوں چمنستانِ ادب کے بلبل   منبعِ علم و عمل ، راہ نما ، شمعِ سُبل

اُنکے نغموں میں بھری رہتی تھی کیفیتِ گل   مستی انگیز تھی مینائے سخن کی قلقل

علم کا جب تک اثر زیرِ فلک باقی ہو
اُن کے انوارِ لیاقت کی چمک باقی ہو

فلکِ علم کے شمس العلماء تھے دونوں   ملکِ شہرت کے رئیس العرفا تھے دونوں
کیا زمانے کو بتائے کوئی کیا تھے دونوں   جن کا ثانی نہیں ایسے کملا تھے دونوں

یادگارِ سلف ایسے نظر آنے کے نہیں
جو ہیں، وہ فیض شناس اپنے زمانے کے نہیں

فنِ تاریخ و ادب فیض رساں ہے جبتک   نثر اور نظم کا دُنیا میں نشاں ہے جبتک
مکتبِ درس میں معنی و بیاں ہے جبتک   صاحبِ نطق کو پروائے زباں ہے جبتک

نام اُن نام وروں کے ہیں درخشاں ایسے
آسماں پر ہیں چمکتے ہوئے تارے جیسے

اُن کی خدمات ہیں مثلِ مہِ تاباں روشن   کون واقف نہیں اس سے کہ وہ تھے کاملِ فن
کیا کلام انکے کمالوں میں کریں اہلِ سخن   پاچکا حسنِ قبول اُن کا ہر اک فعلِ حسن

کب وہ بیکار کوئی کام کیا کرتے تھے
رات دن خدمتِ اسلام کیا کرتے تھے

کارنامے بہت اُن کے ہیں مگر کم از کم   وہ تصانیف جنھیں دیکھ رہا ہے عالم
ان میں سے بعض مضامین یہاں ہونگے رقم   تاکہ معلوم ہو ان دونوں کا فیضانِ قلم

اصل مطلب سے اب آغازِ سخن ہوتا ہے
یعنی اک اک کا بیاں منفرد ہوتا ہے

سیرتِ حضرتِ فاروق[۱] و امامِ اعظم[۲]   حضرتِ مولوی روم[۳] کے حالاتِ وسیم

---

[۱] الفاروق [۲] سیرت النعمان [۳] سوانح مولانا روم

عہد ماموں[۱] کے بیانات وخیالاتِ اتم　　الکلام[۲] اور کبھی تذکرۂ شعرِ[۳] عجم

یہ تصانیف ہیں سب شبلیِ نعمانی کی
دھوم ہی چاروں طرف جنکی سخن دانی کی

سب سے افضل ہی مگر ایک وہ آخر تالیف　　جس سے بہتر نہ ہوئی ہے نہ کوئی ہو تصنیف
صدقِ نیت سے نہ کس طرح کریں ہم توصیف　　کہ ہیں وہ بانیٔ اسلام کے حالاتِ شریف[۴]

جسم اگر اور تصانیف ہیں تو جان وہ ہی
ہر مسلمان کے پندار میں ایمان وہ ہی

ان کتابوں کے سوا اور کتابیں بھی ہیں چند　　قوم کے واسطے ہر طرح جو ہیں فائدہ مند
کردیا نظم کی قیدوں نے کچھ ایسا پابند　　نام موزوں نہ ہوئے کوشش و کد کی ہرچند

نام لکھنے کی ضرورت نہیں سب جانتے ہیں
اہلِ علم اُن کی تصانیف کو پہچانتے ہیں

اور اک کام ہی تالیف کتب سے بھی سوا　　ہفت اقلیم میں جس کام نے مشہور کیا
واہ کیا کام ہے جس کام میں یہ نام ہوا　　بن کے خادم وہ ہر اک شخص کا مخدوم بنا

سب کو معلوم ہے مخفی کوئی اسرار نہیں
کون ندوے کی حقیقت سے خبردار نہیں

قوم تعلیم و تعلّم کو بھلا بیٹھی تھی　　بختِ بیدار کو کم بخت سُلا بیٹھی تھی
مُردہ دل بن کے وہ یاروں کو رُلا بیٹھی تھی　　اپنے سر جتنی بلائیں تھیں بُلا بیٹھی تھی

ایسے ہی چند بزرگوں نے دل افزائی کی
قوم جو مر رہی تھی اس کی مسیحائی کی

آج سے بیس برس پہلے کا یہ ہے مذکور　　کہ ہوئے جمع کچھ اہلِ خرد و اہلِ شعور

---

[۱] المامون [۲] الکلام [۳] شعر العجم پانچ جلدوں میں [۴] سیرت نبوی جلد اول و دوم۔

اور آپس میں کیا مشورہ چند اُمور   اُسی اجمال کی تفصیل ہو ندوے کا ظہور
اختلافات کی اوّل بہت افتاد پڑی
آخرِ کار مگر ندوے کی بنیاد پڑی
فی الحقیقت غرضِ ندوہ نہیں غیر مفید   شہد کو زہر کہے کوئی یہ ہے امر بعید
اچھی تعلیم کی ہر وقت ضرورت ہو شدید   اور رفتار زمانہ کی ہو واجب تقلید
چاہیئے سب کو زمانے کی ہوا پر چلنا
ورنہ انجام میں ہوگا کفِ حسرت ملنا
غرض اس نیک عمل کے تھے جو سچے عامل   کوئی ذاتی غرض انکی نہ تھی اسمیں شامل
سب کے سب تھے فلکِ علم کے ماہِ کامل   رازِ فطرت کے خبردار و امین و حامل
قوم کا اُن کی ہی کوشش سے مقدر چمکا
مشرقی علم کا پھر مہرِ منوّر چمکا
سربرآوردہ تھے اس صف میں جناب شبلی   وہ نہ ہوتے تو نہ پاتا وہ ترقی اتنی
سعی و کوشش سے انھیں کی ہو یہ نوبت پہنچی   کہ بنی دارِ علوم ایک خیالی بستی
نقشہ جبتک ہو یہاں صورتِ انسانی کا
نام ندوے میں ہے ضم شبلیؔ نعمانی کا
اُٹھ گیا ہائے زمانے سے وہ فخرِ دوراں   جس کے ماتم میں ہو آج ایک زمانہ نالاں
اس کا ہمسر نظر آتا نہیں کوئی انساں   مسندِ علم کا وارث کوئی ایسا ہے کہاں
تربتِ حضرتِ شبلی جو نظر آتی ہے
آنکھ ہر اک کی اسے دیکھ کے بھر آتی ہے
آج جس شان کے عالم کی ہو عالم کو تلاش   نظر آتی نہیں وہ شکل وہ صورت و تماش
کیا تعجب ہو جو اپنے علما ہوں خوش باش   مگر افسوس جسے دیکھیے مفلس قلّاش

خاتم مستی کا لقب فقر و غنا رکھا ہے
اپنی ہستی کو بری طرح مٹا رکھا ہے

بادہ عجب و تکبر نے کیا ہے مغرور   نشۂ بغض و تعصب سے ہوئے سب چور
اپنے ہم جنس سبھی ہم قوم سے بے وجہ نفور   علم ہے پاس عمل سے ہیں مگر کوسوں دور
دوسروں کیلئے ہے وعظ و نصیحت کیا کیا
نظر اس پر نہیں اپنی ہے فضیحت کیا کیا

ان معائب سے مبرا تھے مگر نعمانی   نہ ریا اُن میں نہ تھا کبر نہ بالا خوانی
نہ کسی اپنے معاصر سے لڑائی ٹھانی   نہ کبھی آبرو ئے علم پہ پھیرا پانی
زندگی ختم بڑی عزت و توقیر سے کی
اپنی امداد یہ سب اپنی ہی تدبیر سے کی

گریہ ہم کیوں نہ کریں آہ بھی ہم کیوں نہ کریں   ایسے نام آور و علامہ کا غم کیوں نہ کریں
اہلِ علم اُن کے لئے رنج و الم کیوں نہ کریں   مرثیے اُن کے رقم اہلِ قلم کیوں نہ کریں
رنج اس مرگ پہ کیوں کر نہ کرے گا کوئی
سب مریں گے مگر ایسا نہ مرے گا کوئی

ابھی شبلی کا کفن بھی نہ ہوا تھا میلا   دامِ صیادِ اجل کا نئے سر سے پھیلا
لے چلا بھر کے وہ فتراک کا اپنے تھیلا   کر گئے حضرتِ حالی بھی قضا داویلا
چھپ گئے شمس و قمر بچھ گئیں ماتم کی صفوف
ہو گیا ڈیڑھ مہینے میں کسوف اور خسوف

سال پیوستہ[1] ہجری میں رہی تھی اک شب   کہ ہوئی شبلی مرحوم کی جنت سے طلب
عیسوی[2] سال بھی ہونے لگا رخصت یونہی جب   دے گئے حالیٔ مغفور غم و رنج و تعب

[1] ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو مولانا شبلی کا انتقال ہوا اور دوسرے روز ۱۳۳۳ھ شروع ہوا۔
[2] ۳۱ - دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حالی نے رحلت کی اور دوسرے روز ۱۹۱۵ء کی ابتدا ہوئی۔

نسبتِ ایک ہی جہتی کر گئے ظاہر دونوں — سالِ آخر کی طرح ہو گئے آخر دونوں

کوئی پوشیدہ و مخفی نہیں حالِ حالی — حال کے ساتھ ہے وابستہ مقالِ حالی
صورتِ بدر ہے رخشندہ کمالِ حالی — آج دنیا میں نہیں کوئی مثالِ حالی
دل ہے پژمردہ طبیعت میں بحالی نہ رہی — خاک رہتی ہو یہاں صورتِ حالی نہ رہی

اپنے اسلاف کی تصویرِ مجسّم وہ تھے — گو مؤخر تھے مگر فخرِ مقدّم وہ تھے
کاملِ فن وہ تھے اُستادِ مُسلّم وہ تھے — نالہ کش ہجر میں جنکے لئے ہیں ہم وہ تھے
آدمی ایک نہیں، لاکھ نظر آئیں گے
مگر ایسے نہ بشر بارِ دگر آئیں گے

گو بظاہر انھیں سب جان رہے ہیں شاعر — مگر ابتک نہیں اس راز سے اکثر ماہر
جو حقیقت میں ہیں شاعر وہ ہیں شاذ و نادر — شاعری کے لئے درکار ہے علمِ وافر
علما کا ہے یہ حق، منصبِ جہال نہیں
یہ تفنّن کوئی بازیچۂ اطفال نہیں

رتبہ شاعر کا حقیقت میں ہے اسدرجہ بلند — کہ نہ پہنچے گی جہاں عام خیالوں کی کمند
طبعِ موزوں کی مدد بھی ہو بہت فائدہ مند — مگر آتا نہیں بے ایڑھ کے قابو میں سمند
جبتک امداد نہ ہو علم کی افزونی سے
کام کچھ چلتا نہیں طبع کی موزونی سے

واعظ و شاعر و سیّاح و وکیل و قاضی — کرنی پڑتی ہے زمانے کی جنھیں نبّاضی
گر نہ ہوں عالمِ مستقبل و حال و ماضی — خاک پھر مدِّ مقابل کو کریں گے راضی
مرجعِ خلق بنایا ہے خدا نے اُن کو
اسلئے علم کے بخشے ہیں خزانے اُن کو

شاعرِ کاملِ فن حضرتِ مولانا تھے — علم و عقل و ہنر و فضل میں مولانا تھے

صائبِ الرائے تھے صاحبِ خرد و دانا تھے — فحش جذبات و خیالات سے بے گانا تھے

شاعری کے لئے وہ موجدِ اندازِ جدید
محفلِ شعر میں وہ چھیڑ گئے سازِ جدید

جس نے دیکھا ہے تصانیف کو حالی کی بغور — اس کو معلوم ہے کیا شان تھی اُنکی کیا طور
تھا مبارک شعرا کے لئے مرحوم کا دور — اب کوئی ان کا مخالف ہو تو یہ بات ہے اَور

تھے خوشامد طلبِ صلہ نہ وہ درباری تھے
نہ مثالِ شعرا رسا کی ناداری تھے

شاعری کرتے تھے پیشہ نہ سمجھتے تھے مگر — تھی نظر اپنی لیاقت پہ اُنھیں آٹھ پہر
ذاتی اغراض کسی وقت نہ تھیں مدِ نظر — بلکہ ہر کام میں تھا نفعِ بنی نوعِ بشر

اپنے منھ سے کوئی فقرہ بھی نہ بے سود کہا
جب کہا شعر تو وہ شعرِ بہبود کہا

ہے جو مجموعۂ نظم اُن کا وہ بے مثل ہے سب — خالی از فائدہ گویا نہیں کوئی مطلب
آشنا حرفِ غلط سے نہ ہوئی جنبشِ لب — فرد فرد ان کی ہے روحِ سخن و جانِ ادب

شک ہو جس کو تو وہ مرحوم کا دیوان دیکھے
لطفِ شعر و سخن و شانِ سخن دان دیکھے

دیکھئے نظم میں جزر و مدِ اسلام کی شان — جس پہ سارے شعرا کے ہیں دواوین قرباں
اس مسدس کا ہر اک شعر ہے ایمان کی جان — اکثر اشعار کا جس کے ہے مؤید قرآن

سب سے اعلیٰ ہے جو تصنیف مقدس وہ ہے
شش جہت میں ہے جو مشہور مسدس وہ ہے

اس مسدس کے سوا اور بھی ہیں مثنویاں — بعض نظموں کے جداگانہ ہیں قائم عنواں
اور قطعات و غزل سے بھی ہے زیبِ دیواں — ہر طرح سب کا دلآویز ہے اندازِ بیاں

اُن کے دیوان میں ہر صنفِ سخن پائیں گے
اُردو والے بہت ماہرِ فن پائیں گے

اُن کی نظموں کو جو بخشی ہے خدا نے تاثیر — اس اثر کی نہیں ملتی ہے کہیں اور نظیر
وہ دلآویز وہ دلچسپ ہے شانِ تحریر — کر لیا کرتی ہے بے ساختہ دل کو تسخیر

گو کہ ہم عہد ہیں ہم لوگ ذرا فصل نہیں
مگر اب جو ہیں وہ ہیں نقل کوئی اصل نہیں

اہلِ فن اُنکو سمجھتے تھے ہر اک بات میں فرد — نظم کی طرح وہ تھے نثر کے میدان میں مرد
انکی نثریں تھیں جو دلچسپ تو نظمیں پُر درد — گرمِ بازاریِ مضمونِ کہن کر گئے سرد

پانسہ اُلٹا ہوا اب کُہنہ خیالی کا ہے
رائج الوقت جو سکہ ہے وہ حالی کا ہے

ہائے اے خطۂ ہند اے وطنِ اہلِ کمال — کیا ہوئی آج تری شانِ عروج و اقبال
عہدِ ماضی کی طرح اب نظر آتا نہیں حال — جس طرف دیکھیے موجود ہیں ادبار و زوال

دولتِ علم ہے باقی نہ وقارِ قومی
لے گئے چھین کے اغیار شعارِ قومی

پڑھیے اب فاتحہ اخیر کہ ہر بات گئی — وہ زمانہ گیا وہ دن گئے وہ رات گئی
شوکتِ قوم گئی شانِ کمالات گئی — قصہ کوتاہ بزرگوں کی کرامات گئی

دولتِ علم بچی بھی تھی جو کچھ لے دے کر
چل دیے شبلی و حالی سوئے جنت لے کر